کتاب اللمع فی التصوف اسلامی تصوف پر لکھی جانے والے پہلی کتاب

اللمع

مصنف
ابونصر سراج الطوسی

مترجم
پروفیسر اسرار بخاری

تصحیح وتخریج: **عطاء المصطفیٰ مظہری**

کتاب محل

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ ادارہ کتاب محل سے باقاعدہ تحریری اجازت
کے بغیر کہیں بھی شائع نہیں کیا جا سکتا، اگر اس قسم کی کوئی بھی سورتحال ظہور پذیر
ہوتی ہے تو قانونی کاروائی کا حق محفوظ ہے۔

نام کتاب	**اللّمع**
مصنف	ابونصر سراج الطوسی
مترجم	پروفیسر اسرار بخاری
تصحیح وتخریج	عطاء المصطفیٰ مظہری
قیمت	

زیر سرپرستی
پیر عبدالخالق قادری
سجادہ نشین خانقاہ قادریہ بھرچونڈی شریف
خصوصی کاوش
صاحبزادہ سید احسان گیلانی
اشاعت حافظ الملت اکیڈمی خانقاہ عالیہ قادریہ بھرچونڈی شریف

کتاب محل
دربار مارکیٹ لاہور
محمد فہد 0321-8836932

نئی، پرانی، عربی، فارسی، اُردو، انگریزی کتب کا مرکز
ادارے کے پاس 100 سالہ پرانے نسخہ جات دستیاب ہیں
اپنی کتابیں پرنٹ کروانے کیلئے رابطہ فرمائیں
مسودہ دیں تیار کتاب لیں

فہرست

مقدمہ	13
تعارفِ تصوف، مسلکِ صوفیہ اور بحیثیت علماء ان کا مقام	15
طبقات محدثین اور ان کے مخصوص علوم وفنون	18
طبقات صوفیہ اور اُن کے	22
نظریات واحوال اور خصائص ومحاسن	22
صوفیہ کے مخصوص آداب، احوال اور علوم	22
خلوص اعمال	23
صوفیہ اور حقیقتِ حقوق	23
دیگر علوم ومعانی میں صوفیہ کا امتیازی مقام	24
صوفیہ عظام پر چند الزامات اور اُن کی تردید	26
قرآن حکیم میں صوفیہ کے مختلف اسماء	26
صوفیہ کرام کی نظر میں فقہاء ظاہر کی حیثیت	28
اور فقہ کی مدلل تعریف	28
علوم دینیہ اور اس کے ماہرین	30
صوفی کو ''صوفی'' کیوں کہتے ہیں؟	32
اصطلاح صوفی کی تحقیق	32
ثبوت علمِ باطن	33
حقیقتِ تصوف	34
صوفیہ کون ہیں؟	35
توحید اور موَحد	37
پہلی، دوسری، تیسری	38
معرفت اور عارف	43
حقیقتِ عارف، ذریعۂ معرفت	46
احوال ومقامات	48
مقامات اور ان کی حقیقت	48
مفہومِ احوال	48
مقامِ توبہ	49
ورع	50
زہد	51
طبقاتِ زہاد	51
فقراء	52
مقامِ صبر، شبلی اور ایک اجنبی کا مکالمہ، اصنافِ صابرین	54
مقامِ توکل	55
درجاتِ توکل	56
توکل ام سے متعلق اقوال صوفیہ	56
توکل خاص اقوال صوفیہ کے آئینے میں	57
توکل خاص الخاص اور اقوالِ صوفیہ	57
مقام رضا اور اہل رضا	57
رضا اور اقوالِ صوفیہ	58
طبقاتِ اہلِ رضا	58
احوال صوفیہ عظام علیہم الرحمہ	59
مراقبہ، اہل مراقبہ کے طبقات	59
حالِ قرب	60
درجاتِ قرب	61
محبت	62
قول عزوجل:	62
خوف، اقسامِ خوف	64
رجاء	65
اقسامِ رجاء	66
مفہومِ خوف وامید (رجاء)، جذب وشوق	67
مقاماتِ اہل شوق، اُنس	68
احوالِ اہلِ انس، اطمینان	69

اقسامِ اطمینان	70
مشاہدہ	71
احوالِ اہل مشاہدہ، یقین	72
طبقاتِ اہل یقین	73
قرآن فہمی واتباع قرآن میں مقرب صوفیہ کا مقام	75
اتباع کتاب اللہ	75
دعوت واصطفاء	77
مخاطبین کلام الٰہی کے درجات اور	81
قبولِ خطاب میں ان کا باہمی تفاوت	81
سماعت قرآن حکیم کے ذریعے اخذ اسرار ومعانی	85
سماعت قرآن کے تین طریقے	85
غیب کیا ہے؟	86
صوفیہ کرام اور قرآن فہمی	87
ذکر مومنین:	87
شرکِ خفی	88
جہالت علم اور عمل کی اچھوتی تشریح	89
مقامِ سابقین مقربین اور ابرار قرآنی آیات کے آئینے میں	90
ادراکِ حقائق اور استطاعت مومنین	91
قرآن اور تاکید اعمال	92
مطالب حروف واسماء	94
باء بسم اللہ کی صوفیانہ تشریح	94
نیکی وبدی کیا ہے؟	94
اسم ذات اللہ ہر صورت میں بامعنی ہے	94
قرآن کریم سے استنباط کرنے اور سمجھنے کے غلط اور صحیح اصول	96
اتباع اسوۂ رسالتماب ﷺ	100
صوفیہ کی قرآن فہمی اور اتباع اسوۂ حسنہ	100
آنحضور ﷺ کے خداداد بلند اخلاق وعادات	104
مومنین کو اللہ کی عطا کردہ سہولتوں اور	110
عنایتوں سے متعلق احادیث	110
صوفیہ اور اتباع رسول ﷺ	113
صوفیانہ تشریحات	115
صوفیاء کے نزدیک مفہوماتِ قرآن وحدیث	115
علوم واحوالِ تصوف سے متعلق صوفیہ کی تشریحات کا باہمی اختلاف	117
خصائص رسول اللہ ﷺ قرآن کی روشنی میں	119
خصوصیاتِ رسول ﷺ	120
اندازِ خطاب، حبیب وخلیل	121
معراجِ جسمانی	123
رسول ﷺ اللہ کے خصائص	125
احادیث کی روشنی میں	125
احادیث نبوی اور صوفیہ کے اخذ کردہ مفہومات	128
صحابہ رسول رضوان اللہ علیہم اجمعین	131
ذکر ومحاسنِ صحابہ	131
سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ	133
مدحِ صدیقؓ میں ابوالعتاہیہ کے چند اشعار	136
سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ	137
امیر المؤمنین حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ	139
امیر المومنین حضرت علی ابنِ ابی طالب رضی اللہ عنہ	141
اوّلیں شارحِ احوال ومقامات	142
اصحابِ صفہ رضوان اللہ علیہم اجمعین	145
فضائلِ صحابہ رضی اللہ عنہم	
آدابِ صوفیہ	154
صوفیہ کے آدابِ طہارت ووضو	156
صوفیہ اور آداب نماز	160
نماز کے کچھ اور آداب	162
صوفیہ اور آداب زکوٰۃ وصدقات	164
شوقِ فقیری	166
احادیث کی زکوٰۃ	167
حقیقتِ غناء	167
آدابِ صوم اور صوفیہ کرام	168
صوم داؤدی	169

روحِ عبادت	170
یک روزہ زندگی	172
صوفیہ کے آدابِ حج	173
حج صوفیہ سے متعلق چند واقعات	174
وادیٔ حجاز میں رہنے کے آداب	175
سفر و حضر میں صوفیا کے آداب اور باہمی روابط	179
فقیرِ صادق، انتظارِ وصل، مخصوص خصائل فقراء	179
صوفیا کا نظریہ ملکیت	180
صوفیہ کے آداب صحبت	182
معیارِ دوستی	182
علمی مذاکرات اور آداب صوفیہ	185
کلمہ فناء کا خمار	187
علمِ علماء	187
صوفیہ کے معمولات مجالس ضیافت اور طعام کے بارے میں	188
صوفیہ اور آدابِ وجد و سماع	191
چاک گریباں نہیں چاکِ دل چاہتے	191
وجدِ غیر ارادی	192
صوفیہ کے آدابِ لباس	193
لباسِ فقر	193
صوفیہ کے آداب سفر	195
صوفیہ کا اپنے ساتھیوں کے لیے کامل ایثار	197
دنیوی تحائف اور صوفیہ کرام	199
عجیب و غریب امانت	200
صوفیہ کے آدابِ کسب معاش	201
ایک مکتوب	201
حصول و عطا اور فقراء پر مہربانی کرنے سے متعلق صوفیہ کا طریق	203
تربیتِ اولاد اور تزویج کے آداب	205
عبادت گزار میاں بیوی	205
ایک سوال اور اس کا جواب	206
صوفیہ خلوت اور جلوت میں	207

صوفیہ کی فاقہ کشی کے آداب	208
بیماری میں صوفیہ کے آداب	209
مشائخ کا اپنے مریدین سے حسن سلوک	211
مقامِ صحبت، احترام مشائخ	211
آداب مریدین اور سالکین	213
آدابِ خلوتیاں	215
آداب محبت و رفاقت	216
صوفیہ کے دنیا سے کوچ کرنے کے آداب	217
شاد باش اے دل	217
شہادت گہِ الفت	218
مسائل تصوف سے متعلق صوفیہ کے مختلف نظریات	219
جمع و فرق	219
فناء بقاء	220
فناء و بقاء کے چار مدارج	220
مسئلہ حقائق	221
خدا تعالیٰ کی تعریف	223
علم، حقیقت اور حق	223
حقیقتِ انسانیت	223
وصل و عقل	223
مسئلہِ صدق	223
اخلاص	224
مخلص کی علامت	225
ذکر الٰہی	225
حقیقت غناء	226
مسئلۂ روح	227
اشارہ	229
اللہ کی جانب اشارہ کرنے سے متعلق اقوالِ صوفیہ	229
ظرف	230
مروت	230
لفظ صوفی کی تحقیق	230

سبب رزق	230
رزق کی بلا امتیاز تقسیم، مقام فنا اور عبدیت،	231
یکسانیتِ مدح وذم، سکونِ قلب، ایک انجانا غم	231
فراستِ مؤمن	232
وہم، عقل اور فہم	232
ظلم، مقصد اور سابق بالخیرات کی تشریحات	232
امید اور تمنا	233
فرعون اور سرِ نفس	233
غیرت بشریہ اور غیرت الٰہیہ	233
گناہ تصورِ گناہ اور نیتِ گناہ	233
احوالِ قلوب	233
آزمائش کی تین صورتیں	234
حب اور ود میں فرق	234
گریہ وزاری	234
شاہد	235
خلوصِ معاملات وعبادات	235
فیاضی	236
فکر	236
تفکر وفکر میں فرق	236
اعتبار	236
نیت	237
درست کیا ہے؟	237
خلق خدا پر شفقت	237
پرہیزگاری	237
سر	237
صوفیہ کے مکتوبات	239
مکتوب عمرو بن عثمان مکی علیہ الرحمہ بنام طائفۂ بغداد	239
مکتوب ابوبکر شبلی علیہ الرحمہ بنام ابوالقاسم جنید علیہ الرحمہ	239
جواب جنیدؒ بنام شبلیؒ	240
ابوعلی رودباریؒ کا ایک مکتوب	240
ابورودباریؒ کے نام ابوعلی بن ابی خالد صوریؒ کے ایک مکتوب سے اقتباس	240
ایک شیخ کا مکتوب	241
ایک دانا کے نام یوسف بن حسینؒ کا مکتوب	242
ابوالعباس احمد بن عطاؒ اور ابوسعید خرازؒ کی خط وکتابت	242
نامہ بنام حبیب	243
ایک شیخ کے مکتوب سے اقتباس	243
ہرن کی رفاقت	243
مصائب سے پیار	243
مکتوبِ جنیدؒ	244
صوفیہ کی کتابوں سے چند تعارفی اقتباسات	247
جنید بغدادیؒ کی ایک کتاب کا پیشِ لفظ	247
ایک اور اقتباس	247
اقتباس	247
اقتباس	247
اقتباس	248
ابوعلی رودباریؒ کی ایک تحریر	248
ابوسعید ابن الاعرابیؒ کی ایک تحریر	248
ایک اور اقتباس	249
ابوخراز کی تحریروں سے چند اقتباسات	249
کردی الصوفی الارموی کی ایک تحریر	250
دقی علیہ الرحمہ کی چند تحریریں	250
ایک اقتباس	250
احوال واشارات پر مبنی صوفیہ کے اشعار	252
ذوالنونؒ کے اشعار	252
ابوالقاسم جنید علیہ الرحمہ کے اشعار	252
ابوالحسین نوریؒ کے ابیات	253
قنادؒ کے چند اشعار	253
جنید بغدادیؒ کے دو اشعار	253
ابوعلی رودباریؒ کے اشعار	254

ابراہیم الخواصؒ کے اشعار	254
سمنون علیہ الرحمہ کے اشعار	255
ابوالحسن سری سقطیؒ کے پسندیدہ اشعار	256
بستر مرگ پر شبلیؒ کا پسندیدہ شعر	256
سہل بن عبداللہؒ کے اشعار	258
یحییٰ بن معاذ رازیؒ کے اشعار	258
ابوالعباس کے شکر سے متعلق اشعار	258
درندہ موت سے بچانے کا باعث بنا	259
ابونصر بشر بن الحارثؒ کے چند اشعار	259
یوسف بن حسین رازی کے اشعار	260
ابوعبداللہ القرشیؒ کے اشعار	260
ابوعبداللہ ہیکلیؒ کے اشعار، ابوعبداللہ قرشیؒ کے نام	260
اشعارِ صوفیہ سے متعلق ایک احتیاط	261
متقدمین مشائخ کی دعائیں	263
ذوالنونؒ کی دعائیں	263
دعائے یوسف بن الحسینؒ	264
دعائے جنید بغدادیؒ	264
ابوسعید دنیوریؒ کی دعا	265
ابوبکر شبلیؒ کی دعا	266
یحییٰ بن معاذ رازیؒ کی دعائیں	266
ابراہیم بن ادھمؒ اور ڈوبتا سفینہ	267
سری سقطی کی دعا	267
دعائے خضر علیہ السلام	267
وجوہات دعا	268
صوفیہ کی باہمی وصیتیں	269
سماع	272
حسن آواز، سماع اور مستمعین کے مختلف درجات	272
خوش گلو حبشی اور مست اونٹ	274
سماع اور اس کے مفہوم سے متعلق صوفیہ کے مختلف اقوال	275
عوام الناس کے لیے جوازِ سماع کی شرائط	277

جواز سماع	277
شاعری	280
سماع اور بعض فقہا وعلماء	280
سماع خواص اور ان کے درجات	282
طبقاتِ اہلِ سماع	284
سماعِ قرآن کرنے والا طبقہ	284
سماعِ قصائد واشعار	288
سالکین اور مبتدئین کے احوالِ سماع	290
متوسط درجے کے شیوخ کا سماع	292
سماع کے بارے میں مخصوص اہلِ کمال صوفیاء کا طرزِ عمل	295
صوفیہ اور محافلِ سماع	296
ذکر، وعظ اور اقوال سننے کا بیان	297
سماع سے متعلق کچھ اور باتیں	298
وہ صوفیا جو سماع، قرآن کو گانے کے انداز میں پڑھنے	300
اشعار و قصائد اور وجد و رقص کو صحیح نہیں سمجھتے	300
حقیقتِ وجد	302
وجد کرنے والوں کی صفات	304
رات باز مشائخ کا تواجد	306
غلبۂ وجد کی قوت	308
وجد میں ساکن اور متحرک رہنے والے	310
ابوسعیدؒ بن الاعرابی کی تالیف۔۔۔ کتاب الوجد کی تلخیص	311
تحقیق آیات وکرامت	315
آیات وکرامات کا مفہوم اور بعض اہلِ کرامت کا ذکر	315
انوکھی ضیافت	315
نگاہِ کیمیا اثر	315
ابوسلیمان خواصؒ اور ان کا گدھا	316
علم کی فضیلت	316
گمشدہ چیز کو پانے کی ایک مجرب دعا	316
اولیاء اللہ سینوں کے بھید جانتے ہیں	316

انکار کراماتِ اولیاء پر اہلِ ظاہر کے دلائل، کراماتِ اولیاء کے جواز پر دلائل اور اس سلسلے میں انبیاء و اولیاء کا باہمی فرق	317
کرامات اور تادیب نفس	317
کرامات اولیاء کے ثبوت پر دلائل اور کرامات کو انبیاء کے لیے مخصوص سمجھنے والوں کی خامی	319
تسبیح جام	320
پانی پر چل پڑے اور درندوں نے رستہ دیا	320
سیدالرسل ﷺ کا اعزاز	321
کرامات میں خواص کا مقام اور بعض اہلِ کرامت کا	322
خوفِ فتنہ کے باعث کرامت سے اظہارِ ناپسندگی	322
بے مثال پرہیزگاری	323
مشابہت فرعون سے احتراز	324
اصطلاحات صوفیہ اور ان کی تشریحات	325
الحق بالحق للحق	325
منہ، بہ اور لہٗ	325
حال	325
مقام	325
مکان	326
مشاہدہ	326
لوائح	326
لوامع	326
الحق	327
حقوق	327
تحقیق	327
تحقیق	327
حقیقت	327
الخصوص	328
خصوص الخصوص	328
اشارہ	328

ایماء	328
رمز	329
صفاء	329
صفاء الصفاء	329
زوائد	330
فوائد	330
شاہد	330
مشہود	330
موجود اور مفقود	330
معدوم	331
جمع	331
تفرقہ	331
غیبت	331
غشیۃ	331
حضور	331
صحو و سکر	332
سکر اور غشیت میں فرق	332
صحو، حضور میں فرق	332
صفو الوجد	332
ہجوم و غلبات	333
فناء اور بقاء	333
مبتدی	333
مرید	333
مراد	333
وجد	334
تواجد و تساکر	334
وقت	334
البادی	334
وارد	334
خاطر	334

واقع 334
قادح 335
عارض 335
قبض وبسط 335
ماخوذ اور مستلب 336
دہشت 337
حیرت 337
تحیر 337
طوالع 338
طوارق 338
کشف 338
شطح 338
الصول 339
ذہاب 340
نفس 340
حس 340
توحید عامہ 340
توحید خاصہ 341
تفرید 341
تجرید 341
اُھم المفرد اور السر المجرد 341
محادثۃ 342
مناجاۃ 342
مسامرۃ 342
رؤیۃ القلوب 342
اسم 343
رسم 343
وسم 343
روح اور تروح 344
نعت 344
صفت 344
ذات 344
خلق اور خالق 344
حجاب 345
دعویٰ 345
اختیار 345
اختبار 346
البلاء 346
اللسان 346
سر 347
عقد 347
اُھم 348
اللحظ 348
محو 348
محق 349
اثر 349
کون 349
بون 349
وصل 350
فصل 350
اصل 350
فرع 350
طمس 351
الرمس اور الدمس 351
قصم 351
سبب 352
نسبت 352
صاحب قلب ہونا 352
رب حال 352
صاحب مقام 353

بے نفس ہونا	353
صاحب اشارہ	353
انا بلا انا ونحن بلا نحن	353
انا انت وانت انا	353
من تو شدم	354
ہو بلا ہو	355
قطعِ علائق	355
بادی بلا بادی	355
التحلی	355
تجلی	356
تخلی	356
العلۃ	357
اَزل	357
ابد اور ابدیت	357
وقتی مسرمد	358
بحری بلا شاطیٔ	358
نحن مسیرون	359
تکوین	359
بذل المہج	360
تلف	360
اللجاء	360
انزعاج	361
جذب الارواح	361
الوطر	361
الوطن	362
الشرود	362
قصود	363
اصطناع	363
اصطفاء	363
مسخ	364

لطیفہ	364
امتحان	364
حدث	364
الکلیۃ	365
تلبیس	365
شرب	365
ذوق	366
عین	366
اصطلام	366
حریت	367
رین	367
غین	367
الوسائط	368
شطحیات وکلماتِ صوفیہ جو بظاہر قبیح مگر دراصل صحیح ہیں	369
معنیٰ شطحیات اور منکرین شطحیات کی تردید	369
تشریحِ علوم، علماء کی علمی مشکلات اور ان کی صحت پر دلائل	371
علوم رسالت مآب ﷺ	372
علوم شریعت کی اقسام	372
شطحیات ابو یزید بسطامی علیہ الرحمۃ مع تفسیر جنید بغدادی علیہ الرحمۃ	374
ابو یزید بسطامیؒ کی ایک شطح اور اس کی تشریح	375
ابو یزید بسطامیؒ کی ایک اور شطح اور اس کی تشریح	378
ابو یزید بسطامیؒ کا ایک قول اور اس کی تشریح	381
صاحبِ کتاب اللمع اور ابنِ سالم میں	384
ابو یزید بسطامیؒ کی شطحیات پر ایک مباحثہ	384
فرعون اور بایزید بسطامیؒ	384
صوفیہ کرام پر علم الحقائق تک رسائی حاصل کئے بغیر معترض ہونا گمراہی ہے۔	386
اکتسابِ فیض کا طریق	386
ذکر اور مذکور	387

ابن سالمؒ کے مرید خاص اور صاحبِ کتاب اللمع	387
مفلوظاتِ ابوبکر شبلی علیہ الرحمۃ اور ان کی تشریح	389
تصرفِ اولیاء	389
مقام مصطفی وانکسار مصطفی ﷺ	389
ابوبکر شبلیؒ کی ایک شطح کی تشریح	391
اولیاء اللہ پر بغیر سوچے سمجھے طعن وتشنیع گناہِ عظیم ہے	391
ابوبکر شبلیؒ کے بعض اقوال پر اعتراضات	393
ضیاعِ مال کی حقیقت	393
کلام ابوبکر شبلی علیہ الرحمۃ کی تشریح اور جنید بغدادیؒ سے ان کی گفتگو	396
ابوبکر الواسطیؒ کے ملفوظات	400
فضیلت درود	400
سید الرسل ﷺ لاثانی وبے نظیر ہیں	400
دعائے رسول ﷺ	401
مقام مصطفی ﷺ	401
اولیاء اللہ پر تنقید اللہ سے روگردانی کی علامت ہے	401
مدعیان تصوف کی غلطیاں اور ان کی وجوہات	402
صوفیہ کے تین اصول	402
تصوف میں غلطی کرنے والوں کے طبقات اور ان کی غلطیوں کی نوعیت	403
فروعات میں غلطی کرنے والے	404
فقر وغنا میں غلطی کرنے والے طائفے	404
اسبابِ دنیوی کی کثرت وقلت اور کسبِ معاش	406
ارادات میں غفلت، مجاہدات میں غلطی اور آرام وآسائش اختیار کرنا	408
ترکِ طعام، عزلت نشینی اور ترک دنیا	410
تصوف لہو ولعب، کا نام نہیں	412
حریت وعبودیت	413
اختیار مصطفی ﷺ	414
اخلاص میں اہل عراق کی غلطی	415
نبوت وولایت میں غلطی کرنے والے	416
فضیلت ولایت ونبوت	416
کرامات سید الرسل ﷺ کی اتباع سے ملتی ہیں	417
اباحت وعدم اباحت میں غلطی کرنے والا فرقہ اور اس کے نظریات کی تردید	418
فرقۂ حلولیہ کی لغزشیں اور ان کے نظریات	420
فناء بشریت کو غلط معانی پہنانے والے	421
رویت بالقلوب کو غلط سمجھنے والے	422
صفاء وطہارت میں غلطی کرنے والے	424
انوار کا غلط مفہوم	425
نورِ الٰہی	425
انوارِ قلوب	425
عین الجمع میں غلطی کرنے والوں کا بیان	426
صدیق آور زندیق	426
انس، بسط اور ترکِ خشیت کا غلط مفہوم سمجھنے والوں کا بیان	427
اوصافِ بشری کی بنا کا غلط معنی	428
مراد لینے والوں کا بیان	428
گمشدگی حواص اور اس کا غلط مفہوم	429
روح سے متعلق غلط نظریات	430
روح کے بارے میں اہل حق کا نظریہ	430

تعارفِ تصوف، مسلکِ صوفیہ اور بحیثیت علماء ان کا مقام

مجھ سے کسی شخص نے علم تصوف اور مسلک صوفیہ کے بارے میں استفسار کرتے ہوئے سوال کیا کہ لوگ مذکورہ موضوعات کے بارے میں اختلاف رکھتے ہیں۔ کچھ تو ان کی فضیلت بیان کرنے میں بہت غلو سے کام لیتے ہیں بعض انہیں دائرۂ معقولیت سے باہر لے جاتے ہیں، کچھ انہیں لہو ولعب اور جہالت سے آنکھیں بند کر لینے کا عمل گردانتے ہیں۔ بعض لوگ انہیں تقویٰ، تقشف، اونی لباس پہننے، بے تکلف پاکیزہ گفتگو کرنے اور پاکیزہ لباس پہننے وغیرہ کا نام دیتے ہیں۔ اور کچھ انہیں الحاد و گمراہی سے تعبیر کرتے ہیں۔ الغرض وہ یہ چاہتا تھا کہ میں اسے ایسا جواب دوں کہ جو مسلک صوفیہ کے اصولوں کتاب اللہ کی اتباع، رسول اللہ ﷺ کی پیروی، صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم کے اخلاق و اطوار اور اللہ کے صالح بندوں کے آداب سے ہم آہنگ ہو۔ اور میں اپنے جواب کو قرآن وسنت کی روشنی میں اس مدلل انداز سے بیان کروں کہ حق و باطل جدا جدا نظر آئیں۔ تصوف کی جملہ اقسام اپنی اپنی جگہ واضح ہو جائیں۔ اور یہ بھی ثابت ہو جائے کہ کیا علم تصوف علومِ دینی میں سے ایک ہے؟

مذکورہ بالا سوال کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہوں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی کتاب میں مومنوں کو کتاب اللہ سے تمسک کرنے اور اسے مضبوطی سے تھامنے کا حکم دے کر ان کے دلوں سے جملہ شبہات کو دور کر دیا اور دین کی بنیادیں مستحکم کر دیں۔

جیسا کہ فرمایا:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ [آل عمران:۱۰۳]

ترجمہ: ’’اور اللہ کی رسی مضبوط تھام لو سب مل کر آپس میں پھٹ نہ جانا۔‘‘

اور فرمایا:

تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۠ [المائدہ:۲]

ترجمہ: ’’اور نیکی اور پرہیز گاری پر ایک دوسرے کی مدد کرو۔‘‘

اور پھر ایک اور مقام پر اللہ نے فرشتوں کے بعد اپنے بندوں میں سے افضل اور دینی اعتبار سے اعلیٰ رتبہ رکھنے والوں کا ذکر فرمایا۔ اور خود اپنی وحدانیت پر فرشتوں کے بعد انہیں بندگانِ خاص کو گواہ ٹھہرایا۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ۭ [آل عمران:۱۸]

ترجمہ: ’’اللہ نے گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتوں نے اور عالموں نے انصاف سے قائم ہو کر۔‘‘

رسول اللہ ﷺ سے روایت ہے آپ نے فرمایا:

''علماء انبیاء کے وارث ہیں۔''①

میرے نزدیک ''اولوالعلم'' سے مراد ورثۃ الانبیاء (الانبیاء کے وارث) ہے۔ کیونکہ کتاب اللہ کو مضبوطی سے تھامنے والے، اتباعِ رسول میں مجاہدہ کرنے والے، صحابہ و تابعین کی پیروی کرنے والے، اور اس کے متقی پسندیدہ بندوں کے راستے پر چلنے والے یہی لوگ ہیں۔

اس کے نیک بندوں کی تین قسمیں ہیں۔ محدثین، فقہاء اور صوفیہ، اور ان ہی تین اقسام کے لوگوں کا تعلق ''اولوا العلم قائماً بالقسط'' سے ہے جو کہ انبیاء کرام کے وارث ہیں۔ اسی طرح علوم کی بے شمار اقسام ہیں۔ جن میں سے ایک علم، دین ہے جس کی تین قسمیں ہیں۔ علم قرآن، علمِ سنن و بیان اور علم حقائق ایمان۔ اور یہی وہ علوم ہیں جو محدثین، فقہاء اور صوفیہ میں متداول ہیں۔

الغرض جملہ علومِ دین مذکورۃ الصدر تین آیاتِ مبارکہ، حدیث رسول اللہ ﷺ اور اولیاء اللہ کے قلوب سے صادر ہونے والی حکمت سے خارج نہیں اور اس کی اصل حدیث الایمان ہے۔ جب جبریل علیہ السلام نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر دین کے تین اصولوں اسلام، ایمان اور احسانِ ظاہری و باطنی کے بارے میں سوال کیا اور حقیقت یہ ہے کہ اسلام تو ظاہر ہے اور ایمان وہ ہے جو ظاہری بھی ہو اور باطنی بھی مگر احسان حقیقتِ ظاہر و باطن کو کہتے ہیں۔ جیسا کہ ہادی برحق علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

ترجمہ: ''احسان یہ ہے کہ تو اس طرح اللہ کی عبادت کرے کہ گویا تو اسے دیکھ رہا ہے۔ اور اگر تو اسے نہیں دیکھ رہا تو وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔''②

جبریل نے یہ سن کر آپ کی تصدیق کی۔

علم کا قریب ترین رشتہ عمل سے ہے۔ اور عمل کا تعلق اخلاق سے ہے۔ جب کہ اخلاص یہ ہے کہ بندہ اپنے علم و عمل کے ساتھ اپنے معبود حقیقی کی خوشنودی حاصل کر لے۔ مومنین کے یہ تینوں اصناف (محدثین فقہاء اور صوفیہ) علم و عمل کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف اور اپنے مقاصد اور مراتب کے لحاظ سے فضیلت میں باہم یکساں نہیں ہوتے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ حکیم میں ان کی باہمی فضیلت اور درجات کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے:

الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ؕ [المجادلہ:۱۱]

ترجمہ: ''اور ان کے جن کو علم دیا گیا درجے بلند فرمائے گا۔''

اور فرمایا:

وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۚ [الاحقاف:۱۹]

ترجمہ: ''اور ہر ایک کے لیے اپنے اپنے عمل کے درجے ہیں۔''

---

① بروایت حضرت ابو درداء، سنن ابن ماجہ، سنن ترمذی اور صحیح ابن حبان وغیرھم میں، جبکہ امام احمد نے ''المسند'' میں حضرت صفوان المرادی ؓ سے اسے روایت کیا ہے۔ حمزہ الکنانی نے اس روایت کو حسن قرار دیا۔

② حدیث جبریل کے نام سے معروف متفق علیہ روایت جس کے راوی حضرت ابو ہریرہ ؓ ہیں۔

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

> اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ [بنی اسرائیل:۲۱]
>
> ترجمہ: ''دیکھو ہم نے ان میں سے ایک کو ایک پر کیسی بڑائی دی۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

> ''لوگ آپس میں اس طرح برابر ہیں جیسے کنگھی کے دندانے، کسی کو کسی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں مگر صرف علم اور تقویٰ کی بنیاد پر۔''①

اگر کسی کو دین کے اصول، فروع، حقوق، حقائق، حدود اور احکام کی ظاہراً باطناً سمجھ نہ آئے تو اس پر لازم ہے کہ وہ محدثین، **فقہاء اور صوفیہ** کی طرف رجوع کرے۔ ان مذکورہ تینوں اصناف کے لوگ علم وعمل حقیقت اور حال سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ اور انہیں علم، عمل، مقام، کلام، فہم وفراست اور بیان میں سے اسی قدر حصہ ملتا ہے کہ جس قدر انہوں نے حاصل کیا اور جو کھو دیا سو اس سے جاہل رہے۔ ان میں کسی کو یہ کمال حاصل نہیں ہوتا کہ تمام علوم کا احاطہ کر سکے، جو جس مقام پر فائز ہوتا ہے وہ فقط اللہ ہی کے حکم سے ہوتا ہے۔ ان شاء اللہ میں آگے چل کر ان جملہ اصنافِ عباد کے اس پہلو سے بحث کروں گا کہ انہوں نے کس کس علم یا عمل کی کون سی قسم پر عبور حاصل کیا۔ ان کی فضیلت میں باہمی فرق کی کیا وجوہات ہیں اور یہ کہ ان میں سے اعلیٰ طبقہ کونسا ہے۔

---

① امام دیلمی نے مسند الفردوس میں حضرت سہیل بن سعد رضی اللہ عنہ سے اس حدیث کو روایت کیا۔

طبقات محدثین اوران کے مخصوص علوم وفنون

اس عنوان کے تحت طبقات محدثین، ان کا طریقِ روایت، معرفتِ حدیث اور علم حدیث میں ان کے مخصوص مقام کے بارے میں بیان کریں گے۔

محدثین کرام نے خود کو حدیثِ رسول اللہ ﷺ کی ظاہری صورت سے متعلق رکھا اور کہا کہ یہ دین کی اساس ہیں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا [الحشر:۷]

ترجمہ: ''اور جو کچھ تمہیں رسول عطا فرمائیں وہ لو اور جس سے منع فرمائیں باز رہو۔''

جب انہیں (محدثین) اس طرح قرآن حکیم نے خطاب کیا تو وہ اس سلسلے میں دور دراز کے سفروں پر روانہ ہو گئے، راویانِ حدیثِ رسول سے ملاقاتیں کیں، ان کے پاس قیام کیا، ان سے احادیث نقل کیں اور صحابہ وتابعین سے جو کچھ روایت کیا گیا اُسے جمع کیا پھر ان تمام معلومات کو اکٹھا کر کے محفوظ کر لیا جو انہیں صحابہ وتابعین کے حالاتِ زندگی، اعمال و آثار، مسالک، احکام میں اختلاف، اقوال، احوال اور ان کے اخلاق کے بارے میں میسر آ سکیں۔ انہوں نے تمام روایات کو بذاتِ خود سنا اور انتہائی ضبط و احتیاط کے ساتھ درایت کے کڑے اصول کے مطابق ان کی صحت کا خیال رکھا اور یہ بھی پیش نظر رکھا کہ راوی ثقہ ہو تو یہی صفات اس سے پہلے کے راوی میں بھی موجود ہوں کہ جس سے اس نے روایت کیا۔ اور اس طرح ثقاہت کا یہ سلسلہ حدیث کے پورے سلسلۂ اسناد میں آخر تک چلا جائے۔

انہوں نے راویانِ حدیث سے نقل وضبط کے دوران ان کی جائے بود و باش سے بھی واقفیت حاصل کی اور ان کے اسماء کنیتوں اور سنین پیدائش و وفات کو بھی مدون کیا۔ اور یہ بھی معلوم کیا کہ راویانِ حدیث میں سے کس نے کتنی حدیثیں روایت کیں، کس سے روایت کیں اور کس سے نقل کیں۔ اور ان میں سے کس سے دورانِ نقل غلطی ہوئی، کس نے ارادی طور پر غلطی کی اور کس نے غیر ارادی طور پر۔ مختصر یہ کہ مذکورہ تمام اصول وضوابط کو برپا کرنے کے بعد انہیں دروغ گو اور راست گو راویوں کے ناموں کا علم ہو گیا، ایسے راویوں کا پتہ چلا جو روایت میں اکیلے تھے، یا ان کی روایت دوسروں کی روایت سے بحیثیت الفاظ مختلف تھی، بہرحال انہیں یہ علم ہو گیا کہ ہر حدیث کو کتنے راویوں نے بیان کیا اور اس کے نقل کرنے والوں میں کیا کمزوری تھی۔

اس کے بعد محدثین نے تمام احادیث کو اکٹھا کر کے ان کے علیحدہ علیحدہ باب قائم کیے صحیح احادیث کو ان احادیث سے جن میں اختلاف تھا یا جس کا راوی ضعیف تھا، جدا کر دیا تا کہ متفق علیہ اور مختلف فیہ احادیث میں فرق واضح ہو۔ اور ہر کم اور زیادہ حدیثیں روایت کرنے والے راوی کی روایت کی خوب چھان بین کی۔ مختلف علاقوں کے ائمہ کی احادیث کو سمجھا اور طبقات رواۃ کے بارے میں بھی واقفیت حاصل کی کہ ان میں بلحاظ عمر کون چھوٹا تھا اور کون بڑا۔ کون پہلے تھا اور کون اس کے بعد اس کے علاوہ ان محدثین کرام نے روایت حدیث میں راویوں کے اختلاف سے متعلق جملہ اسباب و علل ترمیم و تنسیخ اور

ان کی جائے بود و باش کا پوری طرح جائزہ لیا۔ چونکہ حدیث دین کی اساس ہے اور محدثین کرام اس فن میں ایک دوسرے پر فضیلت رکھتے ہیں حتیٰ کہ ان میں سے بعض تو یہ حق رکھتے ہیں کہ فنی مہارت اور زبردست قوتِ حافظہ رکھنے کے لحاظ سے علماء پر جرح، رد اور قبولِ حدیث کے سلسلے میں ان کی گواہی قابلِ قبول ہوتی ہے اور اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے قول و فعل، امر و نہی اور دعوت کے سلسلے میں ان کی گواہی بھی قابل قبول ہوتی ہے۔ قولِ باری تعالیٰ ہے:

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ [البقرة:١٤٣]

ترجمہ: ''اور بات یوں ہی ہے کہ ہم نے تمہیں سب امتوں میں سے افضل کیا کہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور یہ رسول تمہارے نگہبان و گواہ۔''

اس آیت کی تفسیر میں کہا جاتا ہے کہ شہداء سے مراد اصحابِ حدیث ہیں۔ جو کہ رسول اللہ ﷺ ان کے صحابہ اور تابعین کے اقوال و افعال پر گواہ ہوں گے۔ اور يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا کا مفہوم یہ ہے کہ خود سید الرسل ﷺ اپنے اقوال و افعال، احوال اور اخلاق کے بارے میں محدثین کرام کی گواہی پر شاہد ہیں۔

قول نبوی ﷺ:

''جس نے (میرے قول و فعل سے متعلق) مجھ پر جھوٹ باندھا وہ یہ جان لے کہ جہنم ہی اس کا ٹھکانہ ہے۔'' ①

ایک اور حدیث ہے کہ اللہ ان کے چہروں کو رونق و تازگی بخشے جو مجھ سے سن کر اسے دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ ② آپ کی دعا ہی کا اثر ہے کہ محدثین کے چہروں پر رونق ہوتی ہے۔

محدثین نے فنِ حدیث کے مفہوم و معنیٰ اور اصول و قوانین کے بارے میں باقاعدہ تصنیفات کی ہیں اور علومِ دینی کے اس اہم شعبے میں کئی معروف ائمہ فن بھی ہیں جن کے معاصرین ان کی فضیلت علمی، دیانت اور عبقریت و ذہانت کی بنا پر ان کی امامت پر متفق ہیں۔ اس ضمن میں خاصی تفصیلات موجود ہیں تاہم جو کچھ بیان کیا گیا وہ سمجھنے والوں کے لیے کافی ہے۔

---

① حدیث، متواتر ہے جسے ساٹھ سے زیادہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے روایت کیا جن میں ''عشرہ مبشرہ'' بھی شامل ہیں۔

② اصحابِ سنن نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت کیا ہے، امام ترمذی نے اس پر حکم لگاتے ہوئے اسے ''حسن صحیح'' قرار دیا جبکہ امام سیوطی نے اسے احادیث متواترہ میں شمار فرمایا۔

طبقاتِ فقہا اور ان کے مخصوص علوم وفنون

اگر چہ طبقات فقہاء کو محدثین پر فضیلت حاصل ہے مگر وہ محدثین سے کاملاً اتفاق کرتے ہیں۔ فقہاء، فہمِ حدیث، استنباط اور ترتیب احکام میں دقت نظری، حدودِ دین اور اصولِ شریعت میں گہری تحقیق کا ملکہ رکھتے ہیں۔ انہی نے کتاب وسنت اور اجماع وقیاس کی روشنی میں ناسخ ومنسوخ اصول وفروع اور خصوص وعموم کو جدا جدا بیان کر کے ان میں فرق کو واضح کیا ہے۔ مسلمانوں کی سہولت کے پیشِ نظر قرآن وحدیث کے احکام کو بیان کیا اور بتایا کہ وہ کون سی آیات واحادیث ہیں جن کا حکم تو منسوخ ہے مگر ان کی تحریری صورت باقی ہے۔ اور وہ کون سی آیات واحادیث ہیں جن کی تحریری صورت باقی نہیں مگر ان کا حکم موجود ہے۔ اور وہ کون سی آیات واحادیث ہیں جو لفظی حیثیت سے تو عام ہیں مگر مفہوم کے اعتبار سے خاص ہیں، یا لفظی طور پر خاص ہیں اور معنوی اعتبار سے عام ہیں۔

اسی طرح اس بات کی بھی وضاحت کر دی ہے کہ کن آیات واحادیث میں خطاب جماعت سے ہے مگر اس سے مراد کوئی ایک فرد ہے۔ یا کس مقام پر خطاب ایک سے ہے اور مراد جماعت ہے۔

انہوں نے جہاں مخالفین کو عقلی دلائل سے بھرپور جواب دیئے وہاں گمراہوں کی واضح دلائل سے رہنمائی بھی کی ہے۔ اور لاریب ان کی یہ تمام مساعی فقط خدمتِ دین کے لیے تھیں۔

انہوں نے استنباط احکام میں بالترتیب نصِ قرآنی، حدیث رسول، نص قرآنی پر قیاس اور اجماعِ امت کو اپنا محور بنایا۔ جنہوں نے ان سے مناظرہ کرنا چاہا ان سے باقاعدہ آداب مناظرہ کے مطابق گفتگو کی۔ اور جو مجادلہ کرنا چاہتے تھے ان سے اسی کے آداب کے مطابق پیش آئے۔ اور اپنے مخالفین کا مقابلہ حتمی دلائل وشواہد کے ساتھ کیا۔ الغرض انہوں نے ہر بات موقع ومحل کی مناسبت سے کی۔ ہر شرعی حد کو قائم رکھا، مختلف پیچیدہ اصطلاحات والفاظ کے معانی واضح کئے، مزید یہ وضاحت بھی کر دی کہ اوامر ونواہی میں سے کون سے احکامات ضروری ہیں کون سے مستحسن ہیں اور کون سے ترغیبی وترہیبی ہیں۔ جن احکام میں اشکال تھا رفع کر دیا، عقدے کھول دیئے، قوانین واضح کر دیئے، شبہات زائل کر دیئے، اصول سے فروع کی تخریج کی، اجمال کی تشریح کی اور حدود دین کو اس احتیاط کے ساتھ بیان کیا کہ کوئی کمی باقی نہ رہی اور اس بات کی ہرگز گنجائش باقی نہ چھوڑی کہ کوئی شخص کسی کی تاویل وغیرہ میں آ سکے (یعنی احکام کو بہت واضح کر کے بیان کیا۔)

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہی فقہاء کا طائفہ ہی ہے جس نے مسلمانوں کے حدود وقوانین کی حفاظت کی۔ اور یہی ہیں جن کا ذکر قرآن یوں کرتا ہے:

فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ [التوبہ:۱۲۲]

ترجمہ: ''تو کیوں نہ ہوا کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک جماعت نکلے کہ دین کی سمجھ حاصل کریں۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

’’جس سے اللہ تعالیٰ کوئی اچھا کام لینا چاہے اسے دین کی سمجھ عطا فرماتا ہے۔‘‘ ①

فقہاء کرام نے علوم فقہ میں مستقل تصنیفات چھوڑی ہیں۔ اور ان میں مشہور ائمۂ فن ہو گزرے ہیں جن کی امامت پر امت کا اجماع ہے۔

اس بارے میں مزید کہنا باعثِ طوالت ہوگا۔ بہر حال عقل مند کم سے ہی زیادہ کا کام لے سکتا ہے۔

---

① بروایت حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ، صحیح بخاری، صحیح مسلم اور مسند احمد ہے، جبکہ سنن ترمذی میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، امام ترمذی نے اسے صحیح قرار دیا۔

طبقات صوفیہ اور اُن کے نظریات و احوال اور خصائص و محاسن

صوفیہ کرام کے تمام طبقے محدثین و فقہاء کے معتقدات سے کامل اتفاق کرتے ہیں۔ اور ان کے علوم و فنون مطالب و مفاہیم اور طریقوں سے کوئی اختلاف نہیں رکھتے بشرطیکہ ان میں لہو و لعب پر مبنی بدعات کی آمیزش نہ ہو اور خود ان محدثین و فقہاء پر پیروئ رسول کا غلبہ ہو۔

وہ صوفیہ کرام جو علمی لحاظ سے فقہاء و محدثین کے مرتبے کے نہیں ہوئے وہ ''حکم من احکام الشریعۃ اوحد من حدود الدین'' اس کا ترجمہ اس قدر واضح نہیں ہے یون کیا جائے تو شاید بہتر ہے احکام شریعت بھی اور اُصول دین کی حدود جیسے مشکل مسائل کے حل کے لیے وغیرہ وغیرہ کے مشکل مسائل کے حل کے سلسلے میں انہی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اور جس مسئلے پر فقہاء محدثین متفق ہوں اس کو تسلیم کر لیتے ہیں۔ اور جہاں فقہا و محدثین میں اختلاف پایا جاتا ہو وہاں صوفیہ کا طریق یہ ہے کہ احسن، اولیٰ، اور مکمل ترین صورت کو اپنایا جائے تاکہ اللہ نے جو احکام صادر فرمائے ہیں ان پر انتہائی حزم و احتیاط کے ساتھ عمل ہو سکے۔ صوفیہ کے ہاں امور دین کے سلسلے میں کسی قسم کی چھوٹ، تاویل، آسائش ڈھونڈنے اور شبہات کو راہ دینے کی کوئی گنجائش نہیں۔

جو کچھ سطور گزشتہ میں بیان ہوا وہ تو صوفیہ کے اس طرزِ عمل کے بارے میں تھا جو وہ فقہاء و محدثین کے ظاہری متداول علوم کے بارے میں اپناتے ہیں۔ اور اس کے بعد ان کے عمل کا ایک اور درجہ ہے اور وہ ہے۔ مراتب بلند کی جانب بڑھنا۔ الغرض صوفیہ اخلاقِ جمیلہ اور عبادات و حقائقِ عبادت و اطاعت کے جن بلند ترین احوال و منازل پر فائز ہوئے اور جن اسرار و رموز سے وہ مختص ٹھہرے وہ فقہاء محدثین کو حاصل نہ ہوئی۔

صوفیہ کے مخصوص آداب، احوال اور علوم

صوفیہ کرام کی کچھ خصوصیات ہیں جن میں وہ باقی لوگوں سے منفرد ہیں۔ پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جب فرائض کی ادائیگی اور افعال ممنوعہ سے اجتناب کرتے ہیں تو اس کے ساتھ ہی اپنے سے غیر متعلق چیزوں کو علیحدہ کر دیتے ہیں اور ہر اس تعلق کو ختم کر دیتے ہیں جو ان کے اور مطلوب و مقصود کے درمیان حائل ہو۔ اور اس کا مطلوب و مقصود فقط اللہ ہی ہے۔

اور ان کے کچھ مخصوص آداب ہیں مثلاً زیادہ کے مقابلے میں تھوڑی سی دنیوی دولت پر قناعت قوتِ لا یموت ضروری لباس، بچھونا اور دیگر انتہائی ضروری چیزوں پر گزارہ، امیری پر فقیری کو ترجیح کثرت کے مقابلے میں قلت پر قناعت، شکم سیری

ابوبکر شبلی علیہ الرحمۃ سے ایک شخص دلف بن جحدر نے توحید مجرد کی حقیقت کے بارے میں استفسار کیا تو انہوں نے فرمایا: تجھ پر افسوس ہے کہ توحید مجرد کے بارے میں زبانی وضاحت چاہتا ہے حالانکہ جس نے توحید کو الفاظ کا جامہ پہنایا وہ ملحد ہوا، جس نے اس کی طرف اشارہ کیا وہ شرک ٹھہرا، جو اس سے خاموش رہا وہ جاہل ہے جس نے خود کو واصل سمجھا اسے کچھ ہاتھ نہ آیا، جس نے خود کو قریب سمجھا وہ دور ہے اور جس نے بتکلف وجد طاری کیا اس نے سب کچھ کھو دیا۔

جان لو کہ تم نے جب کبھی اسے اپنے اذہان، عقول اور خیالات کی مدد سے بزعم خود پوری طرح پہچاننے کی کوشش کی تو بیشک تمہارا نتیجہ باطل اور تمہارے اپنے وجود ہی کی طرح مصنوعی ثابت ہوا۔

اگر ہم یہاں ابوبکر شبلیؒ علیہ الرحمۃ کے توحید سے متعلق مذکورہ بالا قول کی کچھ وضاحت پیش کر دیں تو بے محل نہ ہوگا۔ کہنا یہ ہے کہ ان کی تمام تر تعریف توحید کا خلاصہ، قدیم کو حادث کے ذریعے پہچاننے سے علیحدہ کرنا ہے۔ یعنی یہ ممکن ہی نہیں کہ انسان جو کہ حادث ہے وہ اللہ کی ذات قدیم کو واقعتاً پہچان سکے یا اس کی وصل حاصل کر سکے۔

بندوں کے لیے سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ وہ اللہ کے بتائے ہوئے احکامات کے مطابق اس کی حمد و ثنا اور عبادت انجام دیتے رہیں۔

یوسف بن حسین نے توحید کی تین تعریفیں بیان کی ہیں:

پہلی:

توحید عامہ سے متعلق ہے اور وہ یہ ہے کہ صرف وحدانیت کے پیش نظر رہتے ہوئے اضداد، امثال، اشکال اور انداد غائب ہو جائیں۔ اس حالت میں کہ حقیقتِ تصدیق کے غائب ہو جانے اور حقیقتِ اقرار کے باقی رہنے کے ساتھ رغبت و خوف سے سکون ملے۔

مذکورہ تعریف میں حقیقت تصدیق کے غائب ہو جانے سے مراد یہ ہے کہ حقیقتِ تصدیق کے باقی رہنے سے بندہ رغبت و خوف سے سکوں نہیں پا سکتا۔

دوسری:

توحید اہل حقائق: اس کی توحید کی ایک ظاہری تعریف اس طرح ہو سکتی ہے کہ رویتِ اسباب و اشباہ کے غائب ہو جانے کے ساتھ اقرارِ وحدانیت ہو۔ اور یہ اقرار اس طرح ہو کہ امر و نہی پر ظاہر و باطن میں عمل ہو۔ اور قیام شواہد و استجابت کے ساتھ رغبت و خوف ماسوا کا ازالہ کیا جائے۔

اگر چہ سوال کیا جائے کہ معارضہ رُغبت و خوف کے ازالے کا کیا مطلب جب کہ دونوں حق ہیں۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ بلاشبہ رغبت و خوف دونوں حق ہیں اور دونوں اپنی جگہ موجود مگر انہیں غلبۂ وحدانیت نے اس طرح مغلوب کر رکھا ہے جیسے سورج کی روشنی ستاروں کی روشنی پر غالب آ جاتی ہے اور وہ بظاہر نظر نہیں آتے۔

تیسری:

توحید خاص: اور وہ یہ ہے کہ بندہ اپنی حقیقت، وجد اور قلب کے ساتھ اللہ عز وجل کے حضور میں اس طرح حاضر ہو کہ

اس کے تصرفات تدبیر اس پر جاری ہوں اور اس کے احکام قدرت اس پر اس طرح مرتب ہوں کہ بندہ بحر توحید میں غوطہ زن ہو کر پانی مراد کو واقعتاً پانے کے بعد اپنے نفس اور حواس کو فنا کر چکا ہو اور وہ پھر سے اسی طرح ہو گیا ہو جیسا کہ ہونے سے قبل تھا اور اس کا بیان جیسا کہ حضرت جنید نے کہا اللہ کے اس قول میں ہے ''وَاِذْ اَخَذَ رَبُّکَ مِنْ بَنِیْٓ اٰدَمَ'' اس آیت کا ذکر ہم پیچھے کر آئے ہیں۔

حقیقت توحید کے بارے میں مشائخ عظام کا ایک اور بیان بھی ہے۔ اور وہ بیان ہے اس پر فائز ہستیوں کا۔ انہوں نے اس کے بارے میں جو اشارات دیئے ہیں وہ اگرچہ سمجھنے سے بالا ہیں تاہم بعض کا ہم یہاں ذکر کر کے ان کی ممکن حد تک شرح بھی پیش کرتے ہیں۔

یہ اشارات دراصل ایک پیچیدہ علم ہے جو اس کے اہل لوگوں پر تو واضح ہیں اور جب ان کی تشریح کی جاتی ہے تو ان کی رونق ختم ہو جاتی ہے۔ مجھے ان کی تشریح پر اس بات نے ابھارا کہ میں نے ان کا اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے۔ جب کہ کتاب کو وہ بھی پڑھیں گے جو اسے سمجھ لیں گے اور وہ بھی جو نہیں سمجھ پائیں گے اور ہلاکت میں پڑ جائیں گے۔

ہم نے جن اشارات کا ذکر کیا ہے ان میں سے رویم بن احمد بن یزید البغدادی کا یہ قول ہے کہ توحید آثار بشریت کے مٹنے اور صرف الوہیت کے باقی رہ جانے کو کہتے ہیں۔

واضح رہے کہ آثارِ بشریت کے مٹنے سے ان کی مراد عاداتِ نفس کا تبدیل ہو جانا ہے۔ کیونکہ یہ عاداتِ نفس ربوبیت کو اپنی نظر میں اپنے افعال سے منسوب کرتی ہیں۔ جیسے بندے کا کہنا: انا ''میں'' جب کہ اَنَا صرف اللہ ہی کہہ سکتا ہے کیونکہ انیت صرف اللہ ہی کے لیے ثابت ہے۔ یہ تو معنی تھا ''آثار بشریت کے مٹنے'' کا اور ''صرف الوہیت باقی رہ جانے کا مفہوم یہ ہے کہ قدیم کو حادث چیزوں سے بالکل الگ کر لے۔

ایک اور بزرگ کہتے ہیں کہ توحید، توحید کے سوا سب کچھ بھول جانے کو کہتے ہیں۔ یعنی صرف وہی کچھ یاد رہے جس پر حکم حقیقت کا وجوب ثابت ہو۔

مزید کہا کہ وحدانیت حق کے سوا سب کچھ فنا کر دینے اور صرف اس کے باقی رہنے کا نام ہے ماسواء کے فنا سے مفہوم فناء عبد ہے۔ اس طرح کہ اپنے نفس و قلب کے ذکر کو فنا کر کے اللہ کی عظمت اور اسی کے ذکر کو دوام دے۔

ایک شیخ کہتے ہیں کہ توحید میں خلق اور اللہ کے سوا کچھ بھی موجود نہیں ہوتا۔ اور توحید حق تعالیٰ کے لیے ہے جب کہ خلق صرف اس کے طفیل میں ہے۔

توحید کے بیان میں ہم یہ آیت پیش کرتے ہیں اور اسی سے توحید کی حقیقت بیان کرتے ہیں۔

قول باری تعالیٰ ہے:

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ [آل عمران: ١٨]

ترجمہ: ''اللہ نے گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور فرشتوں نے اور عالموں نے انصاف سے قائم ہو کر۔ اس کے سوا کسی کی عبادت نہیں جو عزت والا اور حکمت والا ہے۔''

اللہ نے اپنی توحید پر خلق سے پہلے گواہی دی گویا من حیث الحق توحید کی حقیقت وہی ہے جس پر اللہ نے خود خلق سے پہلے گواہی دی اور من حیث الخلق اس کی حقیقت وہی ہے۔ جو انہوں نے حقیقت و وجد کے اعتبار سے اسی قدر پائی جس قدر اللہ نے ان کے لیے مقرر کی اور جو اس نے ان سے چاہی۔ اور وہ لوگ صرف ''ملائکہ اور اولوا العلم اور قائماً بالقسط'' ہی ہیں۔

اور بطریق اقرار، توحید میں سب مسلمان برابر ہیں۔ اور جو طریق اقرار کا قابلِ اعتماد ہے وہ دل سے ہے زبان سے نہیں۔

ابوبکر شبلی علیہ الرحمۃ کا قول ہے: جس نے توحید کے بارے میں کوئی تصور باندھا، مشاہدہ معانی کیا، علم الاسماء پر عبور حاصل کیا۔ اسماء الٰہی کی اللہ کی طرف نسبت کی اور صفات کو اس سے منسوب کیا اس نے توحید کی بو تک بھی نہیں سونگھی مگر جس نے یہ سب کچھ جاننے کے بعد اسے منفی کر دیا وہی مؤحد ہے مگر رسمی طور پر حقیقتاً نہیں۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ خود ذاتِ حق تعالیٰ ہی توحید سے بہتر طور پر آگاہ ہے وہ خود ہی اثبات صفات ولغوت کرتا ہے اور اسی انداز سے کرتا ہے جیسا کہ اس کے لائقِ شان ہے۔ توحید کو وہ خود اسی لیے بہتر طور پر جانتا ہے کہ اس کے اور توحید کے درمیان کسی ادراک، ال اور توہم کا وسیلہ موجود نہیں ہوتا۔

بعض عارفین کا کہنا ہے کہ توحید وہ ہے جو صاحبِ بصیرت کو اندھا، عاقل کو متحیر اور ثابت قدم کو دہشت زدہ کر دیتی ہے۔ کیونکہ جو بھی حقیقتِ توحید کو جاننے کے مقام پر فائز ہوتا ہے۔ اس کے دل میں عظمتِ کبریا بسیرا کر لیتی ہے اور اس کی ہیبت اس پر طاری ہو جاتی ہے جس کے نتیجے میں بندہ ہیبت زدہ اور اس کی عقل حیرت زدہ ہو جاتی ہے۔

ابوسعید احمد بن عسیٰ خراز علیہ الرحمۃ کہتے ہیں: مقام اولین اسی کو حاصل ہوتا ہے جو علم توحید کو پالیتا ہے۔ اور اس کی مدد سے تمام اشیاء ماسوا اللہ کے ذکر تک کو قلب سے منفی کر کے فقط اللہ کی یکتائی کو جان لیتا ہے۔

آپ نے مزید فرمایا کہ توحید کی پہلی علامت بندے کا جملہ اشیاءً سے خروج یا علیحدگی ہے۔ اور تمام اشیاء کو ان کے پروردگار کی طرف لوٹانا ہے۔ حتیٰ کہ مخلوق اپنے رب کے سامنے ہو اور وہ اسے دیکھتا ہو۔ اس صورت میں کہ وہ خود ان میں قائم اور متمکن ہو، پھر وہ انہیں ان کے نفوس میں اس طرح مخفی کر دے کہ وہ خود اپنے نفس سے مخفی ہو جائیں گویا ان کے نفس کو ان کے نفوس ہی میں مار کر انہیں اپنے لیے منتخب فرما لے۔ اس طرح کی توحید، ظہور توحید کی ثیت سے باب توحید میں دیمومیت ساتھ پہلا داخلہ ہے۔ اور اس کی وضاحت یوں ہے کہ اشیاء ماسوا اللہ کا ذکر قلب سے فنا ہو جائے اور اللہ کا ذکر بندے کے قلب پر اس طرح جاری ہو جائے کہ اللہ کے سوا تمام اذکار زائل ہو جائیں (یعنی اسے سب کچھ بھول جائے اور فقط ذکر خدا ہی یاد رہے۔)

دیمومیت۔ دوام سے ہے یعنی ہمیشہ جاری و باقی رہنا۔

ہر شے سے خروج کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اپنی استطاعت کی طرف یا نفس کی جانب کسی چیز کی نسبت نہ کرے۔ ہر چیز کی مضبوطی یا قوت کو اللہ کے ساتھ قائم مانے۔

جملہ اشیاء کا اپنے مالک کے حضور حاضر ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ وہ ہر چیز کا مالک و متولی صرف اللہ کو جانے اور ان کا وجود اللہ کے ساتھ قائم مانے یہ نہ سوچے کہ اشیاء خود اپنی ذات سے قائم ہیں جیسا کہ کسی نے کہا ہے۔

ترجمہ شعر: ''ہر شے اسی کی وحدانیت کی گواہی دے رہی ہے''۔

اور ہر چیز میں اس کے موجود ہونے سے مراد ہے کہ اگر بندہ اشیاء کی طرف نظر کرے تو اس پر تلوین کا غلبہ نہیں ہو سکتا کیونکہ اشیاء کا وجود اللہ کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔

تلوین اور تمکین تصوف کے دو مقامات ہیں۔ مقامِ تلوین میں حالتیں بدلتی رہتی ہیں اور سالک مغلوب الحال رہنے لگتا ہے۔ جب کہ مقام تمکین میں سالک کو قرار حاصل ہوتا ہے اور کبھی مغلوب الحال نہیں ہوتا۔ (مترجم)

اور یہ قول کہ ''اللہ ان کو ان میں مخفی کر دیتا ہے یہاں تک کہ وہ خود سے خود بے خبر ہوتے ہیں اور انہیں مار دیتا ہے ان کے نفوس ہی میں'' اس کی تشریح یہ ہے کہ انہیں کوئی حس نہیں رہتی اور نہ ہی وہ اپنی ظاہری و باطنی حرکات کو ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ ان کی یہ حرکات اگرچہ بظاہر انہی کے اشاروں سے ہوتی ہیں مگر درحقیقت مشیت وتقدیر ایزدی کے سامنے مٹ جاتی ہیں۔

ابوبکر شبلی علیہ الرحمۃ نے ایک شخص سے فرمایا: جانتے ہو؟ تمہاری توحید کیوں درست نہیں ہوتی۔ اس شخص نے عرض کیا: حضور معلوم نہیں ایسا کیوں ہے۔ آپ نے فرمایا: اس لیے کہ تو اللہ کو خود اپنے ہی ذریعے جاننا چاہتا ہے۔ مزید کہا کہ فقط اس شخص کو توحید سے کامل آگاہی حاصل ہوتی ہے اور اسی کی توحید درست ہوتی ہے جس کا انکار ہی اس کا اقرار ہو۔ اور جب ان سے اس اقرار کی وضاحت پوچھی گئی تو فرمایا: اقرار سے مراد انانیت ہے اور وہ یہ ہے کہ مؤحد اپنے اقرار کا انکار کرے یعنی ہر چیز میں اپنے اثباتِ نفس کو راہ نہ دے جیسے وہ ہے: میرا، مجھ سے، میری جانب، مجھ پر اور مجھ میں وغیرہ۔

یہ ضروری ہے کہ مؤحد انانیت یعنی میں کو ختم کرے اور باطن سے اس کا انکار کرے چاہے بظاہر اس کی زبان پر اقرار ہی کیوں نہ جاری ہو۔

ابوبکر شبلی علیہ الرحمۃ ہی نے ایک اور شخص سے کہا: تو توحید بشری کا طالب ہے کہ توحید خدا کا؟ اس شخص نے جواب دیا: ان دونوں میں کیا فرق ہے آپ نے فرمایا ہاں توحید بشری سزا اور جزا سے ڈرنے کو کہتے ہیں اور توحید خدا یہ ہے کہ تو فقط اللہ ہی کو عظیم سمجھے اور اسی کی توقیر و تعظیم کرے۔

قولِ شبلی علیہ الرحمۃ کی وضاحت یہ ہے کہ عوض پانا اور اللہ کے سوا کسی اور سے طمع رکھنا یا کام بنانے کی توقع کرنا تقاضائے بشریت ہے اسی لیے جس نے صرف اللہ تعالیٰ کی عظمت کے پیشِ نظر اس کو واحد جانا وہ اس شخص کے برابر نہیں ہو سکتا جس نے صرف سزا و جزا کے خوف سے اسے ایک مانا۔ حالانکہ خوفِ عذاب الٰہی بھی ایک اچھی صفت ہے۔

ابوبکر شبلی علیہ الرحمۃ کہتے ہیں کہ جس نے علم توحید میں سے ذرہ برابر علم بھی حاصل کر لیا گویا اس نے اس قدر بڑا بوجھ اپنے سر پر اٹھا لیا کہ اب وہ ایک ذرے کو اٹھانے سے بھی قاصر ہے۔ اور ایک بار فرمایا: کہ جسے علم توحید میں سے ذرہ برابر علم اللہ نے عطا کیا تو گویا اس نے تمام آسمانوں اور زمینوں کو اپنی پلکوں کے ایک بال کی نوک پر اٹھا رکھا ہے۔ یعنی جب اس کے سینے میں اللہ کی وحدانیت کا نور جلوہ گر ہوتا ہے تو ساری کائنات اس کو بہت چھوٹی اور ہلکی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اصل کائنات کا نور اس کے اندر موجود ہوتا ہے اور جملہ مخلوقات اسے ذرہ برابر دکھائی دیتے ہیں۔ جب کہ ایک روایت کے مطابق حضرت جبریل علیہ السلام کے چھ سو پر ہیں۔ اور وہ پر ہی اتنے بڑے ہیں کہ پھیلا دے تو شرق و غرب کو ڈھانپ لے۔ اور ابن عباس سے روایت ہے کہ جبریل علیہ السلام کرسی کے پایے کے سامنے یوں ہیں جیسے زرہ کا ایک حلقہ کہا جاتا ہے کہ جبریل علیہ السلام

عرش، کرسی اور وہ مقام جو اہل علم کو حاصل ہے یہ سب مل کر ملکوت سے ماوراء جو کچھ ہے اس کے مقابل مثل ریت کے ایک ٹیلے کے ہے۔ بلکہ اس سے بھی کم۔

ابو العباس بن عطا بغدادی علیہ الرحمۃ کہتے ہیں کہ حقیقتِ توحید کی علامت، نسیانِ توحید ہے۔ اور صدق توحید یہ ہے کہ اس کے ساتھ ذاتِ واحد کو قائم مانا جائے۔ اس کی وضاحت یوں ہے کہ بندہ اللہ کی توحید میں روایتِ توحید کو اپنی تخلیق سے پہلے بھول جائے اور صرف رویت قیام الٰہی کو باقی رکھے۔ کیونکہ اگر اللہ عز وجل ان کو ان کے ارادے کے مطابق مقصد سے ہمکنار نہ فرمائے تو وہ کبھی توحید کو نہیں پا سکتے۔

ہمارے مشائخ کرام کی موضوعِ توحید پر بیشتر مستقل تصانیف ہیں مگر ہم نے صرف ضرورت کی تکمیل کے لیے ان میں سے بہت کم نکات کا یہاں اس کتاب میں ذکر کیا ی ہے۔

معرفت اور عارف

ابوسعید الخزاز رحمہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے کہ معرفت کے سرچشمے دو ہیں (خوف خدا میں) آنکھوں کا آنسو بہانا اور مقدور بھر مجاہدہ کرنا۔

ابوتراب نخشبی علیہ الرحمہ نے عارف کی تعریف بیان کرتے ہوئے کہا: عارف وہ ہے جسے کوئی چیز مکدر نہ کر سکے اور ہر چیز کو اس سے صفا ملے۔ احمد بن عطاء علیہ الرحمۃ کہتے ہیں ''معرفت دو چیزوں کے جاننے کا نام ہے ایک اللہ دوسرے حقیقت اللہ کو جاننا یہ ہے کہ بندہ اللہ کی وحدانیت کو ان اسماء وصفات کے ذریعے جانے جو اللہ نے خلق کے لیے ظاہر کر رکھی ہیں اور حقیقت کو جاننے کا مفہوم یہ ہے کہ اس تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں کیونکہ اللہ کی صمدیت و ربوبیت درمیان میں حائل ہے جیسا کہ قول عزوجل ہے:

وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا [طٰہٰ:۱۱۰]

ترجمہ: ''اور ان کا علم اسے نہیں گھیر سکتا۔''

کوئی راستہ حقیقت کو جاننے کا نہ ہونے کی تشریح یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی معرفت جو کہ بندوں کی استطاعت سے باہر نہیں، کا ان کو اسماء وصفات کے ذریعے پانے کی اجازت دی ہے مگر حقیقت تک رسائی تو کجا اس میں سے ذرہ برابر کا بھی سمجھ لینا کسی کے بس میں نہیں۔ اس لیے کہ کائنات میں جو کچھ ہے وہ اللہ عزوجل کی عظمت وکبریائی کی وادیوں میں سے پہلے ذرے کے ظاہر ہوتے ہی لاشی ہو جاتی ہے۔ الغرض معرفتِ حقیقت اسی کو حاصل ہو سکتی ہے جس میں عظمت وکبریائی کی صفت موجود ہو (اور بلاشبہ اس صفت سے صرف ذاتِ واجب الوجوب ہی متصف ہے) اسی مفہوم کو ادا کرتے ہوئے کسی کا قول ہے: اسے اس کے سوا کسی اور نے نہیں جانا اور نہ ہی اس کے سوا کسی نے اس کو چاہا۔ کیونکہ اس کی صمدیت (بے نیازی) احاطہ وادراک کو روکے ہوئے ہے۔

قول باری تعالیٰ ہے:

وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ [البقرہ:۲۵۵]

ترجمہ: ''اور وہ نہیں پاتے اس کے علم میں سے''

اس ضمن میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ

''پاک ہے وہ ذات کہ جس نے اپنے بندوں کو اپنی معرفت کا سوائے اس کے اور کوئی راستہ نہیں بتایا کہ وہ اسے اپنی عقلِ قاصر سے ہی جائیں۔

ابوبکر شبلی سے پوچھا گیا کہ کب بندہ مقامِ مشاہدہ پر فائز ہوتا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: جب شاہد ظاہر ہو جائے، شواہد فنا ہو جائیں، حواس جاتے رہیں اور احساس مضمحل پڑ جائے۔

اور جب ان سے مذکورہ کیفیت کے آغاز وانجام کے بارے میں سوال کیا گیا تو کہا: آغاز اللہ کی معرفت ہے اور انجام

اس کی توحید۔ مزید کہا کہ معرفت کی نشانی یہ ہے کہ بندہ خود کو اللہ کے غلبہ وقوت کے قبضہ میں سمجھے اور اسی حالت میں اس پر قدرت کی کارروائیاں جاری رہیں۔

معرفت کی ایک علامت محبت بھی ہے کیونکہ جس نے اس کو پہچانا اسی نے اس سے محبت کی۔ ابو یزید طیفور بن عیسیٰ البسطامی رحمہ اللہ سے صفتِ عارف کے بارے میں استفسار کیا گیا تو آپ نے یوں وضاحت کی کہ پانی کا رنگ وہی ہوتا ہے جو برتن کا۔ اگر اسے سفید برتن میں ڈالا جائے تو تُو اسے سفید سمجھے گا۔ اور سیاہ میں تو اسے سیاہ رنگ کا سمجھے گا حالانکہ مختلف احوال کی تبدیلی اس میں بظاہر یہ تبدیلی پیدا کر رہی ہوتی ہے یعنی پانی اپنی صفاء رنگت کے ساتھ متصف ہوتے ہوئے برتن کے رنگ میں رنگا ہوا دکھائی دیتا ہے مگر درحقیقت برتن کا رنگ اس کی صفاء اور اصل حالت کو تو نہیں بدل سکتا دیکھنے والا چاہے اسے سفید یا سیاہ پائے مگر وہ اپنی مستقل صفت کے ساتھ متصف رہتا ہے۔ اسی طرح عارف اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کے تعلق کی کیفیت دراصل ایک رہتی ہے چاہے احوال بدلتے ہی رہیں۔

جنید بغدادی علیہ الرحمہ نے عارف کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں کہا کہ وہ ان کی تعریف بیان کرنے والوں کی دسترس سے باہر نکل گئے ہیں۔ اور کسی نے معرفت سے متعلق یہ کہا کہ معرفت، اللہ کی توحید کو مطالعۂ قلوب کے ذریعے اس کے لطائفِ تعریف کے مطابق پانے کو کہتے ہیں۔

جنید بغدادی علیہ الرحمہ سے دریافت کیا گیا کہ اے ابو القاسم! عارفین اللہ سے کیا چاہتے ہیں؟ آپ نے جواباً کہا: عارفین اللہ سے اپنے لیے حفاظت و پناہ طلب کرتے ہیں۔

محمد فضل سمرقندی علیہ الرحمہ کہتے ہیں: کہ عارفین اللہ جل جلالہ سے نہ کچھ طلب کرتے ہیں اور نہ ہی وہ کوئی اختیار رکھتے ہیں۔ اسی حالت میں جو انہوں نے پالیا سو پالیا، کیونکہ عارفین اللہ ہی کے ساتھ قائم، باقی اور فانی ہیں۔ محمد ابن الفضل سمرقندی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عارفین اللہ سے اس خوبی کی حاجت رکھتے جس کے ہوتے ہوئے سارے محاسن پورے ہو جاتے ہیں۔ اور جسے کھو کر سارے محاسن قبائح سے بدل جاتے ہیں۔ اور وہ خوبی، استقامت ہے۔ یحییٰ بن معاذ علیہ الرحمہ عارف کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ لوگوں میں شامل ہو کر بھی ان سے جدا ہوتا ہے۔ مزید کہا کہ عارف ایک بندہ ہی تھا جو ظاہر ہو گیا (یعنی ممتاز ہو گیا)

ابو الحسین النوری سے پوچھا گیا کہ یہ کیا بات ہے کہ اللہ کو عقل پا بھی نہیں سکتی اور اس کے سوا وہ جانا بھی نہیں جا سکتا؟ آپ نے جواب دیا: انتہاء والا بے انتہاء کو کیسے پا سکتا ہے یا مصیبتوں کا مکلف اسے کیسے جان سکتا ہے جس کے لیے کوئی منصیبت ہے نہ آفت۔ یا اللہ کی ذات صاحب کیفیت کیونکر ہو سکتی ہے جب کہ خالقِ کیفیت بھی وہی ہے۔ یا وہ پابند زمان و مکان کیسے ہو سکتا ہے جبکہ زمان و مکان کا پیدا کرنے والا بھی وہی ہے۔ اور اسی طرح اس نے اول کو اولیت بخشی اور آخر کو مؤخر کیا۔ اگر وہ ذاتِ جل جلالہ اول و آخر کو پیدا نہ فرماتا تو اولیت و آخریت کا علم کیسے ہو سکتا۔ اور ازلیت فی الواقع ابدیت ہے ان دونوں میں کوئی حدِ فاصل نہیں۔ جیسا کہ اولیت آخریت ہے اور آخریت اولیت بعینہٖ یہی حال ظاہریت و باطنیت کا ہے بس اتنی سی بات ہے کہ محبوب حقیقی کبھی دولت وصال سے نواز دیتا ہے اور کبھی محروم رکھتا ہے صرف اس لیے کہ تجدیدِ لذت ہوتی رہی۔ یعنی وصل و ہجر کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ تا کہ وصل کی لذت میں اضافہ ہوتا رہے۔ اور وہ بندے کی بندگی کو دیکھتا رہے۔

جس نے اسے اس کی صفت تخلیق سے پہچانا اس نے اسے مشاہدے کے ذریعے نہیں جانا اور یہ صفت تخلیق اس کے قول ''کُن'' سے متعلق ہے۔

اور ابو الحسین نوری کے قول مشاہدے کے ذریعے پہچاننے سے مراد یہ ہے کہ بندہ، یقین و مشاہدۂ قلب کے ساتھ ایمان بالغیب کے حقائق کو پوری طرح جان لے اور ان سے مانوس ہو جائے۔

اللہ کے لیے کسی طرح کی توقیت اور تغیر کو لازم قرار دینا کسی طرح بھی جائز نہیں کیونکہ اس کی ذاتِ واجب الوجوب تو جیسی تھی ویسی ہی رہے گی اور جو اس نے فرمایا یا فرمائے گا دونوں حالت میں برابر ہے۔ قریب تر اس کے لیے بعید تر ہے اور بعید تر اس کے لیے قریب تر۔ بلاشبہ خلق کے لیے اس کی معرفت من حیث الخلق ہی ہوتی ہے۔ اور قرب و بعد، رضا و عدمِ رضا میں خلق کی صفتِ تلوین موجود ہوتی ہے اور یہ اللہ کی صفت نہیں۔

احمد بن عطاء علیہ الرحمۃ کا معرفت خداوندی سے متعلق ایک قول جسے ابوبکر واسطی علیہ الرحمہ سے بھی منسوب کیا جاتا ہے۔ جب کہ یہ واقعتاً مقدم الذکر ہی کا قول ہے: وہ کہتے ہیں کہ برائیاں تب برائیاں بنتی ہیں جب انہیں اللہ پوشیدہ رکھتا ہے اور نیکیاں تب نیکیاں بنتی ہیں جب وہ انہیں ظاہر و عیاں فرماتا ہے۔

اور یہ نیکی و بدی دو ایسی صفات ہیں جو ازل سے جاری ہیں اور اللہ کے مقبول اور دھتکارے ہوئے بندوں پر اپنے اثرات مرتب کرتی رہتی ہیں۔ مقبول بندوں پر ان کے شواہد روشنی کی صورت میں اور دھتکارے ہوئے بندوں پر اس کی پوشیدگی کے شواہد ظلمت کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اور ایسی صورت میں زرد رنگ (ٹھرے) چھوٹی آستینیں یا جبے کسی کام نہیں آتے۔

میرے خیال کے مطابق مذکورہ بالا قول مفہوم کے اعتبار سے ابو سلیمان دارانی علیہ الرحمہ کے اس قول سے ملتا جلتا ہے کہ خلق کے اعمال اللہ کو راضی یا ناراض نہیں کرتے وہ جس سے راضی ہو جائے انہیں ایسے اعمال میں لگا دیتا ہے جو اس کی رضا کا باعث ہوتے ہیں اور جس سے ناراض ہو جائے انہیں ایسے کاموں میں مصروف کر دیتا ہے جو اس کی ناراضگی کا سبب بن جاتے ہیں۔

میرے نزدیک ابن عطاءِ علیہ الرحمہ کے قول کی شرح یہ ہے کہ برائیاں اس لیے برائیاں سمجھی جاتی ہیں کہ اللہ ان سے اعراض فرماتا ہے اور نیکیاں اسی لئے نیکیاں بنتی ہیں۔ کہ اللہ ان کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور انہیں قبولیت بخشتا ہے۔

اسی ضمن میں ایک حدیث ہے کہ رسول لاله ﷺ دو صحیفے لے کر نکلے ایک ان کے دائیں اور دوسری ان کے بائیں ہاتھ میں تھا پھر آپ نے فرمایا یہ اہل جنت اور ان کے آباؤ اجداد کے ناموں کی فہرست ہے۔ اور اہلِ دوزخ اور ان کے آباؤ اجداد کے ناموں کی فہرست ہے۔ ❶

ابوبکر واسطی علیہ الرحمہ کا کہنا ہے کہ جب اللہ نے اپنی معرفتِ ذات بندوں کو عطا کر دی تو ان کے نفوس ان سے جدا ہو گئے پھر انہوں نے لذاتِ سرمدی کے شواہد میں سے پہلے نظارے پر کوئی وحشت محسوس نہ کی۔ مذکورہ قول کی وضاحت یہ ہے کہ جس نے اپنے معبود کی عطا کردہ معرفت میں سے پہلے مقام کو پا لیا تو اسے ماسوا اللہ سے نہ کوئی وحشت لاحق ہوئی اور نہ ہی انس۔

---

❶ سنن ترمذی میں بروایت حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص ہے، امام ترمذی نے فرمایا: هذا حديث حسن صحيح غريب۔

حقیقتِ عارف

یحیٰ بن معاذ رازی رحمہ اللہ کہتے ہیں جب تک بندہ معرفت حاصل کرتا رہتا ہے اسے یہ کہا جاتا ہے کہ تو کوئی چیز اختیار نہ کر اور اپنے اختیار سے دور رہ یہاں تک کہ تجھے عرفان مل جائے۔ اور جب بندہ معرفت پا کر عارف ہو جاتا ہے تو اس سے کہا جاتا ہے کہ اب تو چاہے کوئی چیز اختیار کر یا نہ کر تیری مرضی ہے کیونکہ اب تو جو بھی اختیار کرے گا وہ ہمارے اختیار کے ساتھ ہوگا اور جو کچھ ترک کرے گا تو ہمارے ہی اختیار سے ترک کرے گا۔ اس لیے کہ اب تو اختیار و عدم اختیار دونوں حالتوں میں ہمارے ہی اختیار میں ہے۔ اور مزید کہا کہ یہ دنیا ایک دلہن کی مانند ہے جس نے اسے طلب کیا پھر اس کو خود سے دور نہ کر سکا۔

زاہد اس کے چہرے کو سیاہ کرتا ہے۔ اس کے بالوں کو نوچتا ہے اور اس کے کپڑے پھاڑتا ہے۔ اور عارف اپنے محبوب ازلی سے دل لگائے اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔

شیخ مذکورؒ کہتے ہیں کہ جب حصولِ معرفت میں عارف سے ادب کا دامن چھوٹ گیا تو وہ ہلاک ہونے والوں کے ساتھ ہلاک ہوا۔

ذوالنون مصری علیہ الرحمہ کہتے ہیں عارف کی تین نمایاں خصوصیات ہیں۔

پہلی: اس کے سینے میں جب شمعِ معرفت فروزاں ہوتی ہے تو وہ پرہیز گاری کے چراغ کو بجھا نہیں دیتی۔
دوسری: وہ کسی ایسے باطنی علم کا قائل نہیں ہوتا جو اسے ظاہری احکامِ شریعت کی پابندی سے روکے۔
تیسری: اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعامات و اکرامات کی اکثرت اسے حرام چیزوں کے قریب بھی نہیں جانے دیتی۔

کسی شیخ کا قول ہے کہ وہ عارف نہیں جس نے آخرت کی فکر کرنے والے نیکوکاروں سے معرفت کا ذکر کیا چہ جائے کہ دنیا داروں سے اگر عارف اپنے رب کی اجازت کے بغیر اس سے توجہ ہٹا کر خلق کی طرف متوجہ ہوا تو وہ رسوا ہوا۔

اے سالک! تو اسے اس وقت تک نہیں پہچان سکتا جب تک تیرے دل پر اس کی حقیقت کا غلبہ نہ ہو تو اسے کیونکر یاد کر سکتا ہے جب تک تیرے دل میں اس کے لطف و کرم کا احساس موجود نہ ہو۔ کیا تو اس کی صدائے محبت کو بھول گیا ہے؟ جو اس نے وجودِ خلق سے پہلے تجھے دی تھی۔

مجھ سے محمد بن احمد بن حمدون الفراء علیہ الرحمۃ نے کہا کہ کسی شخص نے عبدالرحمان فارسی علیہ الرحمۃ سے کمالِ معرفت کے بارے میں سوال کیا تو کہنے لگے: جب متفرقات ایک ہو جائیں، احوال و مقامات یکساں ہو جائیں اور احساسِ تمیز مٹ جائے تو کمالِ معرفت کا مقام آتا ہے۔

مذکورہ قول کی وضاحت یہ ہے کہ بندے کا وقت ہر حالت میں ایک ہونا چاہیے اس میں کوئی تبدیلی نہ ہو۔ اور وہ تمام حالات میں اللہ کے ساتھ لو لگائے رکھے اور ماسوا سے تعلق کو منقطع رکھے اور یہی وہ لازمی امور ہیں جن کے ہوتے ہوئے سالک کو کمال معرفت کا مقام حاصل ہوتا ہے۔

ذریعۂ معرفت

ابوالحسین نوری علیہ الرحمۃ سے کسی نے پوچھا: آپ نے اللہ کو کس چیز کے ذریعے پہچانا؟ تو انہوں نے فرمایا: اللہ ہی

کے ذریعے ایک اور سوال میں ان سے کہا گیا کہ عقل کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے تو انہوں نے جواب دیا: عقل عاجز ہے اور اپنی ہی طرح کسی عاجز چیز کی پہچان ہی کا سبب بن سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب عقول کو پیدا فرمایا تو اس سے سوال کیا: میں کون ہوں؟ جواباً عقل خاموش رہی۔ پھر اسے سرمۂ وحدانیت لگایا تو پکار اٹھی: اللہ۔ خلاصہ یہ نکلا کہ عقل نے اللہ کو، اللہ ہی کے ذریعے جانا۔

ابوالحسین نوری علیہ الرحمۃ نے ایک سوال کہ اللہ نے سب سے پہلے بندوں پر کون سا فرض عائد کیا تو فرمایا: معرفت جیسا کہ قول خداوندی ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ

ترجمہ: ''اور میں نے جن اور آدمی اسی لیے بنائے کہ میری بندگی کریں۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے لِیَعْبُدُوْنِ (کہ میری بندگی کریں) کی تفسیر یَعْرِفُوْنِ (تا کہ میری معرفت حاصل کریں) سے فرمائی۔ یعنی عبادت کرنے سے مراد معرفت الٰہی کا حصول ہے۔

ایک شیخ سے معرفت کے بارے میں دریافت کیا گیا تو فرمایا: قلب کی گہرائیوں سے جملہ اسماء وصفات کے ساتھ اللہ کی وحدانیت کا اثبات اور اس کی تصدیق کا نام معرفت ہے۔ کیونکہ اسی کی ذات ہی عزت، قدرت، عظمت اور غالب ہونے میں یکتا ہے۔ وہ ہمیشہ زندہ رہنے والا بے مثال، سمیع، بصیر، بے کیف اور بے مثل ہے۔ اور اللہ ہی قلوب سے اضداد، امثال اور اسباب کو دور فرماتا ہے۔ اور معرفت تو ایک عطیہ ہے۔

معرفت آتشِ شوق اور وجد ہے جب کہ ایمان نور اور عطاء و بخشش ہے۔

مومن و عارف میں یہ فرق ہے کہ مومن اللہ کے نور سے دیکھتا ہے اور عارف اللہ کی آنکھ سے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ مومن صاحب قلب ہوتا ہے۔ اور عارف قلب نہیں رکھتا۔ قلبِ مومن ذکر اللہ سے مطمئن ہو جاتا ہے۔ اور عارف کو سوائے محبوب ازلی کے قرار نہیں۔ گویا ایک ذکر حبیب میں محو ہے۔ تو دوسرا رخ یار کے مشاہدے سے شاد کام۔

معرفت کی تین اقسام ہیں۔ معرفتِ اقرار، معرفتِ حقیقت، اور معرفتِ مشاہدہ۔ معرفت مشاہدہ میں فہم، علم اور عبارت وکلام شامل ہے۔

یوں تو معرفت سے متعلق بے شمار اشاراتِ لطیفہ اور تعریفات کاملہ موجود ہیں مگر ان کی وہ قلیل تعداد جو ہم پیش کر آئے ہیں، سالک کے لیے کافی ہیں۔ اس کے علاوہ استدلال کرنے والوں اور ہدایت چاہنے والوں کے لیے بھی ان میں کافی مواد موجود ہے۔

حسن بن علی بن حیویہ دامغانی علیہ الرحمہ کہتے ہیں کہ ابوبکر زاہر آبادی نے معرفت کے بارے میں فرمایا: معرفت ایک ایسا اسم ہے جس کا معنیٰ قلب میں وجودِ تعظیم کی صورت میں موجود ہوتا ہے۔ اور یہ سالک کو تشبیہ و تعطیل سے بچائے رکھتا ہے۔

احوال ومقامات

مقامات اور ان کی حقیقت

اللہ کے نزدیک، عبادات، مجاہدات، ریاضت اور اس کی طرف پوری طرح متوجہ ہونے کے لحاظ سے بندے کا کیا مقام ہے تو اس کے جواب میں قرآن کے یہ الفاظ پیش کئے جاتے ہیں ہیں کہ

ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَخَافَ وَعِيْدِ [ابراهيم:١٤]

ترجمہ: ''یہ اس کے لیے ہے جو میرے حضور کھڑے ہونے سے ڈرے اور میں نے عذاب جو حکم سنایا ہے اس سے خوف کرے۔''

اور فرمایا:

وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ۝ [الصافات:١٦٤]

ترجمہ: ''اور فرشتے کہتے ہیں ہم میں ہر ایک کا ایک مقام معلوم ہے۔''

ابوبکر واسطی علیہ الرحمہ قولِ رسول اللہ ﷺ ''الا رواح جنود مجندہ'' ① کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ارواح اپنے اپنے مقامات کے مطابق جمع ہوں گی۔ اور مقامات یہ ہیں مثلاً توبہ، ورع، زہد، فقر، صبر، رضا اور توکل وغیرہ۔

مفہومِ احوال

صفاء اذکار میں سے جو کچھ کیفیات دلوں میں جاگزین ہوتی ہیں یا دل اس میں مقام اختیار کرتے ہیں، احوال کہلاتے ہیں۔

حضرت جنید علیہ الرحمۃ کا قول ہے۔ حال دل پر نزول کرتا ہے مگر ہمیشہ اس میں نہیں رہتا۔ اور یوں بھی کہا گیا کہ حال ذکر خفی کو کہتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ بہترین ذکر، ذکرِ خفی ہے۔ ②

حال مجاہدات، ریاضات اور عبادات کے طریق پر نہیں ہوتا بلکہ وہ مراقبہ، قرب، محبت، خوف، رجاء شوق، انس، طمانیت، مشاہدہ اور یقین وغیرہ کی طرح ہے۔

ابوسلیمان دارانی علیہ الرحمۃ نے کہا جب معاملہ قلوب تک پہنچ جاتا ہے تو جوارح استراحت کرتے ہیں۔

ابوسلیمان کا یہ قول دو معانی کا حامل ہے۔ ایک یہ کہ یہاں استراحتِ جوارح سے مراد مجاہدات ہیں اور قلب کو اللہ کے

---

① صحیح بخاری بروایت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جبکہ صحیح مسلم، مسند احمد میں بروایت حضرت ابوہریرہ ہے۔

② امام بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے اسے روایت کیا، امام سیوطی نے اس حدیث کو ''صحیح'' قرار دیا۔

ذکر سے غافل کر دینے والے اشغال وخیالات و مذمومہ سے جوارح مامون ہو جاتے ہیں دوسرے یہ کہ بندہ مجاہدہ، اعمال اور عبادات میں اس قدر تمکن حاصل کر لے کہ وہ اس کا ٹھکانہ بن جائیں اور اس کا قلب ان سے لذت وحلاوت پائے۔ اور وہ پہلے کی طرح اب ان میں کرب والم کی کیفیت سے چھٹکارا حاصل کر لے۔ جیسا کہ کسی نے کہا ہے اور میرا خیال ہے کہ محمد بن واسع نے کہا ہے کہ میں برابر بیس برس تک ہر رات کرب کے عالم میں بسر کرتا رہا جس کے نتیجے میں مجھے مسلسل دس برس کی راحت و آسائش نصیب ہوئی۔

میرا خیال ہے کہ مالک بن دینار نے کہا کہ میں لگاتار بیس برس تک قرآن مجید کو چباتا رہا تا آنکہ دس برس تک تلاوت کی لذتوں سے کامیاب ہوا۔ جنید بغدادیؒ کا قول ہے۔ تحفظِ حقوق صرف حراست قلوب سے ملتا ہے اور جس کا باطن نہیں وہ گناہ پر اصرار کرنے والوں میں سے ہے۔

مقامات کے ضمن میں شیوخ عظام کے بے شمار اقوال و جوابات ہیں اور اسی طرح احوال میں بھی مگر ہم نے اختصار کی راہ اختیار کی ہے۔

مقامِ توبہ

ابو یعقوب یوسف بن حمدان السوسی علیہ الرحمۃ نے فرمایا: اللہ کی جانب متوجہ ہونے والوں کا پہلا مقام توبہ ہے۔ اور توبہ ہر اس چیز سے، جس کو علم شریعت نے برا بتایا ہو، سے ہر اس شے کی طرف رجوع کرنے کو کہتے ہیں جسے شریعت نے اچھا اقرار دیا ہو۔

سہل بن عبداللہ علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: توبہ یہ ہے کہ گناہوں کو بھلایا نہ جائے۔

جنید علیہ الرحمۃ نے کہا: توبہ یہی ہے کہ تو اپنے گناہوں کو بھول جائے۔

ابو یعقوب السوسی علیہ الرحمۃ اور سہل بن عبداللہ علیہ الرحمۃ نے توبہ کی جو تعریف فرمائی اس کا تعلق مریدین، طالبین اور سالکین کی توبہ سے ہے۔ اور جنید علیہ الرحمہ کی تعریف توبہ کہ گناہوں کو بھلا دینا چاہیے اس کا تعلق محققین کی توبہ سے ہے۔ کیونکہ یہ وہ بندے ہوتے ہیں جن کے قلوب پر عظمت خدا اور اس کے دائمی ذکر کا غلبہ ہوتا ہے تو وہ گناہوں کو بھول ہی جاتے ہیں۔ جیسا کہ رویم علیہ الرحمہ نے فرمایا: توبہ سے توبہ کرنا ہی توبہ ہے۔ اور اسی طرح ذوالنون مصری علیہ الرحمہ نے فرمایا کہ عوام گناہوں سے توبہ کرتے ہیں اور خواص غفلت سے۔

توبہ کے بارے میں ابوالحسین نوری علیہ الرحمہ نے جو کچھ کہا ہے وہ بلاشبہ توبہ کی خاص الخاص تعریف ہے۔ وہ فرماتے ہیں، توبہ یہ ہے کہ تو اللہ کے سوا ہر چیز سے توبہ کرے۔ اور اسی مفہوم کی طرف ذوالنون علیہ الرحمہ نے یوں اشارہ کیا ہے کہ مقربین کے گناہ ابرار کی نیکیاں ہوتی ہیں۔ مزید کہا کہ ریاء عارفین، اخلاصِ مریدین ہے۔

سالک جب طاعات وقرباتِ الٰہی کے ذریعے ابتداءِ میں اللہ کا تقریب حاصل کرنے کے دوران ان طاعات وقرباتِ الٰہی میں قرار حاصل کرتا ہے، ان کی تصدیق کرتا ہے اور انوار ہدایت سے مالا ہو کر عنایت و رعایت خداوندی کا سزاوار ٹھہرتا ہے۔ اس کا قلب عظمتِ الٰہ کا مشاہدہ کرتا ہے صنعتِ صانع اور احسانِ قدیم پر غور وفکر کرتا ہے تو اپنی ارادت و ہدایات کی صورت میں، طاعات و اعمال اور قربتوں کی طرف التفات اور ملاحظہ وسکون سے تائب ہو جاتا ہے۔

ہمارے سامنے تین طرح کے توبہ کرنے والے ہیں۔ ایک وہ جو گناہوں سے توبہ کرتے ہیں۔ دوسرے وہ جو غفلتوں سے تائب ہوتے ہیں اور تیسرے وہ جو اپنی طاعتوں اور نیکیوں پر نگاہ رکھنے سے توبہ کرتے ہیں۔

ورع

ورع (پرہیزگاری) ایک بلند مقام سلوک ہے

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: ''تمہارے دین کا سرمیہ، ورع ہے۔'' ①

اہل ورع کے تین طبقے ہیں ایک وہ جو شبہات سے اجتناب کرتا ہے اور یہ شبہات حلال وحرام کے واضح احکامات یا مبہم احکات سے تعلق رکھتے ہیں۔

ابن سیرین علیہ الرحمہ فرماتے ہیں، میرے لیے ورع سے برھ کر کوئی چیز آسان نہیں جب بھی مجھے کسی چیز میں شک ہو جائے اسے بلاتردد ترک کر دیتا ہوں۔

اہل ورع کا دوسرا طبقہ ہر اس شے سے اجتناب کرتا ہے جس سے ان کا قلب دوری چاہے اور جسے اختیار کرنا انہیں ناگوار ہو۔ یہ مقام صرف اہل تصدیق اور ارباب قلوب واہل دل کو حاصل ہوتا ہے۔ جیسا کہ حضور رسالتمآب ﷺ نے فرمایا: گناہ وہ ہے جو تیرے دل میں کھٹکے۔ ②

ابوسعید خراز علیہ الرحمہ نے ورع کے بارے میں فرمایا: ورع یہ ہے کہ لوگوں پر تم سے ادنیٰ سا ظلم بھی نہ ہونے پائے اور یہاں تک کہ کبھی کوئی تیرے خلاف ظلم یا کسی زیادتی کی دھائی نہ دے۔

حارث محاسبی علیہ الرحمہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کا ہاتھ ساری زندگی کبھی مشکوک طعام کی طرف نہیں اٹھا۔ جعفر خلدی کہتے ہیں کہ محاسبی علیہ الرحمہ مشتبہ کھانے کی طرف ہاتھ بڑھاتے تو ان کی انگشتِ شہادت کی رگ زور زور سے پھڑکنے لگتی اور اس طرح وہ مشکوک طعام سے خبردار ہو جاتے۔

اسی طرح کا ایک واقعہ بشر حافی علیہ الرحمہ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ انہیں کسی دعوت پر بلایا گیا اور جب ان کے سامنے کھانا چنا گیا تو باوجود کوشش کے ان کا ہاتھ کھانے کی طرف نہیں بڑھ سکا۔ انہوں نے تین بار کوشش کی مگر بے سود۔ ایک شخص نے جو اس راز سے آشنا تھا میزبان سے کہا: اس طرح کے باکمال صوفی کو حرام یا مشکوک طعام پر بلانا مناسب نہیں تھا۔ اس واقعہ کو سہل بن عبداللہ کے اسی طرح کے ایک واقعے سے بھی تقویت ملتی ہے۔

میں نے بصرہ میں احمد بن محمد بن سالم کو یہ کہتے سنا کہ سہل بن عبداللہ سے حلال کی تعریف بیان کرنے کے لیے کہا گیا تو فرمایا: حلال کی تعریف یہ ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے اللہ کی نافرمانی کا اندیشہ نہ ہو۔

جس چیز میں معصیت خدا کا اندیشہ ہو اس کے بارے میں فقط اشارۂ قلب ہی سے جانا جا سکتا ہے۔ اور اس کے لیے بطور دلیل میں رسول اللہ ﷺ کا یہ قول پیش کرتا ہوں: آپ نے حضرت وابصہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا: اپنے دل ہی سے

---

① امام طبرانی، بزار، اور سیوطی نے ان الفاظ کے ساتھ اسے روایت کیا۔ خیر دینکم الورع اس کی اسناد حسن ہے۔

② امام بخاری نے ادب المفرد میں، امام مسلم نے صحیح میں اور امام ترمذی نے سنن میں اسے روایت کیا۔ جبکہ امام احمد نے سندِ حسن کے ساتھ حضرت وابصہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔

پوچھ لیا کرو دوسرے لوگ تو جو چاہیں گے کہیں گے۔'' اور مزید فرمایا: گناہ وہ ہے جو تیرے دل میں کھٹکے۔

رسول اللہ ﷺ کے مذکورہ دونوں اقوال سے آپ بخوبی جان سکتے ہیں کہ جائز اور ناجائز معلوم کرنے کے لیے قلبی اشارے کی طرف رجوع کرنے کی تلقین کی گئی۔

اہل ورع کا تیسرا طبقہ عارفین وواجدین کا ہے ان کے ورع کی کیفیت کے بارے میں ابوسلیمان دارانی علیہ الرحمہ کہتے ہیں کہ ورع یہ ہے کہ تو ہر اس چیز کو برا سمجھے جو تجھے اللہ سے دور کردے۔

سہل بن عبداللہ علیہ الرحمہ ورع کی تعریف یوں بیان کرتے ہیں: حلال یہ ہے کہ اس میں اللہ کی نافرمانی کا اندیشہ نہ ہو اور حلال خالص یہ ہے کہ اس میں اللہ کو بھلا دینے کا شائبہ تک نہ ہو۔

ورع سے متعلق ابوبکر شبلی علیہ الرحمہ نے فرمایا: تیرا قلب ایک لمحے کے لیے بھی اللہ کی یاد سے غافل نہ رہے یہی ورع ہے۔

الغرض تینوں طبقات اہل ورع کی ورع کو اقسام میں ظاہر کیا جائے تو پہلی ورع عام دوسری ورع خاص اور تیسری خاص الخاص ورع ہے۔

زہد

زہد، مقاماتِ تصوف میں سے وہ مقام ہے جو احوال و مقاماتِ بلند کی اساس ہے۔ بلاشبہ اللہ کا قرب حاصل کرنے والوں، اس پر توکل کرنے والوں اور ہر حال میں راضی رہنے والوں کے لیے جادۂ الفت کا پہلا قدم ہے۔ جس نے اس مقام پر فائز ہوتے ہوئے اپنی بنیاد مضبوط نہ کی وہ بعد میں آنے والے مقامات کی طرف ترقی نہ پا سکا۔ چونکہ حب دنیا ہی تمام برائیوں کی جڑ ہے اور اس سے زہد اختیار کرنا ہی ہر بھلائی اور اطاعت کی بنیاد ہے کہتے ہیں کہ جو دنیوی جاہ وحشمت سے محبت کرنے والے کے نام سے مشہور ہوا تو گویا وہ ہزار برے ناموں سے موسوم ہوا اور جسے دنیا سے زہد (یعنی کنارہ کشی) اختیار کرنے والے کے نام سے پکارا جائے تو گویا اسے ہزار اچھے ناموں سے یاد کیا گیا اور زہد کا حلال سے گہرا تعلق ہے کیونکہ حلال اختیار کرتے وقت مشکوک اور حرام چیزوں سے پرہیز کرنا ہوتا ہے۔

طبقاتِ زہاد

زہاد کے تین طبقے ہیں۔ پہلے طبقے کے زہاد کوئی دنیوی ملکیت نہیں رکھتے۔ اور جس چیز سے ان کے ہاتھ خالی ہوتے ہیں اس سے ان کے دل بھی خالی ہوتے ہیں یعنی وہ دل میں بھی کسی دنیوی ملکیت کی خواہش نہیں رکھتے۔ جیسا کہ جنید بغدادی علیہ الرحمہ کا قول ہے: زہد ہاتھوں اور دلوں کا طمع سے پاک ہونا ہے۔ سری سقطی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: جن چیزوں سے ہاتھ خالی ہوں ان سے دِل بھی خالی ہوں تو زہد کی دولت حاصل ہوتی ہے۔

دوسرے طبقے میں وہ زہاد شامل ہیں جنہیں زہد میں انتہائی رسوخ اور استقلال حاصل ہوتا ہے۔ رویم علیہ الرحمہ ان کے بارے میں کہتے ہیں: دنیا میں جو کچھ ہے اس کی خواہش سے نفس کو روکنا صرف زہد میں راسخ و ماہر صوفیہ ہی کا حصہ ہے۔ کیونکہ خود ترکِ دنیا میں بھی زاہد کو ایک طرح کی نفسانی لذت محسوس ہوتی ہے وہ اس طرح کہ لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں۔ اس کی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اور اسے شہرت حاصل ہوتی ہے۔ الغرض جس نے دل کی گہرائیوں سے ان تمام

لذات سے کنارہ کشی یعنی زہد اختیار کیا وہی راسخ و ماہر زہاد میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

زہاد کا تیسرا حلقہ ان صوفیہ پر مشتمل ہے جن کو اس بات کا علم اور یقین ہوتا ہے کہ اگر ساری دنیا ان کی ملکیت اور ان کے لیے حلال قرار دے دی جائے اور انہیں اس پر کسی طرح کے محاسبے کا بھی خطرہ نہ ہو اور وہ بھی جان لیں یہ کہ ایسی حالت میں اللہ کے ہاں ان کے مقام میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی تب بھی وہ دنیا میں زہد ہی کو اختیار کئے رکھیں۔ گویا ان کے زہد کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ جب سے دنیا کی کوئی چیز پیدا کی گئی تب سے انہوں نے اس کی طرف گناہِ التفات نہیں کی۔ اور اگر اللہ کی نظر میں اس دنیا کی وقعت پر پشہ کے برابر بھی ہوتی تو وہ اس دنیا سے زہد اختیار کرنے کو ترک کر دیتے اور ایسا کرنے سے تائب ہوجاتے۔ ❶

ابو بکر شبلی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: زہد غفلت ہے کیونکہ یہ دنیا لاشئ ہے اور لاشئ سے کنارہ کشی یعنی زہد اختیار کرنا صوفی کی غفلت ہی ہے۔

یحیٰ بن معاذ علیہ الرحمہ نے فرمایا: دنیا ایک دلہن کی مانند ہے جس نے ایک بار اس کا قرب حاصل کیا پھر اس سے دور نہیں ہوا مگر زاہد کی پہچان یہ ہے کہ اس دنیا میں رہتے ہوئے ہوئے وہ اس عروس جہاں کے چہرے کو مسخ کرتا ہے، اس کے بال نوچتا ہے اور اس کے کپڑے پھاڑتا ہے مگر ایک کامل و راسخ زاہد کا مقام یہ ہے کہ وہ اپنے محبوب حقیقی جل جلالہ کی محبت میں اس قدر محو و بے خبر ہوتا ہے کہ وہ اس دنیا کی آراستہ و پیراستہ صورت کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔

مقام فقر کی اہمیت کا اندازہ اس آیت مبارکہ سے لگایا جا سکتا ہے۔

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ [البقرہ:۲۷۳]

ترجمہ: ”(تمہارے صدقات) ان فقیروں کے لیے ہیں جو راہ خدا میں رکے ہوئے ہوں اور وہ زمین میں کاروبار کرنے کے لیے سفر نہ کر سکتے ہوں۔“

اور ارشادِ حضور رسالت مآب ﷺ ہے: بندے کے لیے فقر کے گہنے سے بڑھ کر کوئی خوبصورت گہنا نہیں۔ ❷

ابراہیم بن احمد خواص علیہ ارحمہ کا قول ہے:

فقر عزت کا لباس، انبیاء علیہم السلام کا پہناوا، صالحین کا پیراہن، متقین کا تاج، مومنین کا جمال، عارفین کا سرمایہ، مریدین کی آرزو، اطاعت گزاروں کا قلعہ، گنہگاروں کا زنداں، گناہوں کا مٹانے والا، نیکیوں کو بڑھانے والا، درجات بلند کرنے والا، منزل تک پہنچانے والا، اللہ کی خوشنودی کا باعث اور بندوں کی عزت کا باعث ہے۔

فقراء

فقراء تین طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کے پاس اسبابِ دنیوی میں سے کچھ بھی نہیں ہوتا وہ کسی سے ظاہراً کچھ طلب کرتے ہیں اور نہ باطناً۔ کسی سے کسی چیز کے ملنے کی توقع نہیں رکھتے۔ اور نہ ہی کسی سے کچھ لینے کی لالچ رکھتے ہیں۔ یہ مقام مقربین کا ہے۔

---

❶ سنن ترمذی میں بروایت حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ ہے، امام ترمذی نے اسے حسن صحیح قرار دیا۔

امام طبرانی نے حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا، لیکن اس کی سند صحیح نہیں۔

فقراء کے بارے میں سہل بن عبداللہ کا قول ملاحظہ ہو وہ فرماتے ہیں، کسی کو یہ بات کہنا جائز نہیں کہ صوفیہ، فقیر ہیں بلکہ وہ تو اللہ کی مخلوق میں سب سے بڑھ کر غنی ہوتے ہیں۔

ابوعبداللہ ابن جلاء علیہ الرحمہ حقیقت فقر کے بارے میں کہتے ہیں: اپنی دونوں آستینوں کو دیوار پر مار کر کہو کہ میرا پروردگار اللہ ہے۔

ابوبکر زقاق علیہ الرحمہ نے ابوعلی رودباری علیہ الرحمہ سے پوچھا: کیا وجہ ہے کہ فقراء ضرورت کے وقت بھی کسی سے کچھ لینے سے انکار کر دیتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا: اس لیے کہ فقراء عطا کے بجائے عطا کرنے والے پر ہی اکتفا کئے بیٹھے ہوتے ہیں۔ ابوبکر زقاق نے یہ سن کر کہا یہ تو درست ہے مگر میرا خیال ہے کہ فقراء وہ طائفہ ہے جسے کسی کے عطا کرنے سے کچھ فائدہ بھی نہیں پہنچتا وہ فقط وصل یار کے بھوکے ہوتے ہیں۔ اور فاقہ انہیں تکلیف نہیں پہنچا سکتا کیونکہ ان کا مطلوب و مقصود تو صرف اللہ ہی ہوتا ہے۔

میں نے ابوبکر طوسی علیہ الرحمہ کو یہ فرماتے سنا کہ ایک طویل عرصہ تک مختلف لوگوں سے یہ سوال پوچھتا رہا کہ آخر فقراء ہر شے پر کیوں فقر اختیار کرتے ہیں مگر کہیں سے کوئی تسلی بخش جواب نہ مل سکا اور بالآخر میں نے نصر بن الحمامی علیہ الرحمہ سے پوچھا تو انہوں نے فرمایا: فقرا ہر چیز پر اس لیے فقر اختیار کرتے ہیں کہ فقر، منازلِ توحید میں سے پہلی منزل ہے اور مجھے اس جواب نے مطمئن کر دیا۔

فقراء کے دوسرے طبقے کے صوفیہ کی حالت یہ ہوتی ہے کہ کچھ نہ رکھتے ہوئے بھی کسی سے کچھ نہیں مانگتے۔ نہ وہ براہ راست مانگتے ہیں اور نہ بالواسطہ بن مانگے کوئی کچھ دے دے تو اُسے رد نہیں کرتے قبول کر لیتے ہیں۔

جنید علیہ الرحمہ نے فرمایا: سچے فقیر کی نشانی یہ ہے کہ نہ کسی سے کچھ مانگتا ہے اور نہ کسی سے مقابلہ کرتا ہے اگر کوئی مقابل آ بھی جائے تو خاموش رہتے ہیں۔ سہل بن عبداللہ سے فقیر کی تعریف بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: سچا فقیر نہ کسی سے کچھ مانگتا ہے اور نہ ہی اپنے پاس کوئی چیز جمع رکھتا ہے۔

ابوعبداللہ ابن الجلاء علیہ الرحمہ کا قول ہے: تجھے حقیقی فقر تب حاصل ہوگا جب کہ تو نے فقر اپنے نفس کی خاطر اختیار نہ کیا ہو۔ اور جب بھی فقر حقیقی تجھے حاصل ہوگا تو وہ ہرگز تیرے اپنے نفس کے لیے نہ ہوگا۔ اور اس حیثیت سے کہ تو نے اپنے لیے فقر اختیار نہ کیا ہوگا تو تو فقیر یعنی محتاج ہی نہ ہوگا بلکہ درحقیقت غنی ہوگا۔ (یعنی مستغنی باللہ)

ابراہیم الخواص فرماتے ہیں: فقیر صادق کی پہچان یہ ہے کہ وہ شکایت زبان پر نہیں لاتا اور مصائب کے اثرات کو ظاہر نہیں کرتا۔ ایسے مقام پر صدیقین فائز ہوتے ہیں۔

فقراء کا تیسرا طبقہ وہ ہے جس کی ملکیت میں کچھ نہیں ہوتا اور جب کبھی کسی چیز کی ضرورت پڑتی ہے تو اپنے ہی ہم مسلک کسی بھائی سے مانگ لیتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ان کا ہم مسلک بھائی اس کے ایسا کرنے سے خوش ہوگا۔ اور اس طبقے کے فقراء اپنے ہم مسلک بھائیوں سے کچھ طلب کرنے کا کفارہ خلوص کی صورت میں ادا کرتے ہیں۔

جریری علیہ الرحمہ کے مطابق حقیقی فقیر وہ ہے جو معدوم کو طلب کر کے خود کو موجود سے محروم نہیں کرتا۔

رویم علیہ الرحمہ نے فرمایا: ہر دنیوی شے کے عدم کا نام فقر ہے۔ اور فقیر اُسے کہتے ہیں جو دنیوی اشیاء کو اپنے لیے نہیں

بلکہ دوسروں کے لیے حاصل کرے۔ فقر میں یہ مقام صدیقین کو حاصل ہوتا ہے۔

مقامِ صبر

صبر مقامات سلوک میں سے وہ اہم اور اعلیٰ مقام ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اس طرح فرمایا ہے۔

الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ⑩[الزمر:۱۰]

ترجمہ: ''صابروں کو بھرپور اور بے حساب اجر دیا جائے گا۔''

جنید علیہ الرحمہ صبر کے بارے میں کہتے ہیں: تکلیف کا فقط اللہ کے لیے اس وقت تک برداشت کرنا کہ وہ ٹل جائے، صبر ہے۔

ابراہیم خواص علیہ الرحمہ کا قول ہے: اکثر لوگ صبر کے بوجھ کو اٹھانے سے فرار اختیار کر کے دنیوی اسباب کی طلب کا سہارا لیتے ہیں اور وہ ان اسباب پر اس طرح بھروسہ کر بیٹھتے ہیں کہ گویا وہی اُن کے رب ہیں۔

شبلی اور ایک اجنبی کا مکالمہ

کسی اجنبی شخص نے ابو بکر شبلی علیہ الرحمہ سے صبر کے موضوع پر ایک گفتگو کی جو اس طرح ہے:

اجنبی: کون سا صبر، صابرین کے لیے مشکل ترین ہوتا ہے؟

شبلی: صرف اللہ کی اطاعت میں صبر اختیار کرنا مشکل ترین ہے۔

اجنبی: نہیں!

شبلی: خالصتاً اللہ کے لیے صبر اختیار کرنا۔

اجنبی: نہیں!

شبلی: تو کیا وہ صبر کہ جس میں خصوصی انعامات عطا ہوتی ہیں مگر بندہ ادب کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔

اجنبی: نہیں!

شبلی: (غضب ناک ہوکر) تجھ پر افسوس ہے پھر کون سا صبر ہے جو مشکل ترین ہے۔

اجنبی: مشکل ترین صبر یہ ہے کہ بندہ قربِ الٰہی پانے کے بعد بارگاہِ ایزدی سے دور کئے جانے پر صابر رہے۔

یہ سن کر ابو بکر شبلی علیہ الرحمہ نے ایسی چیخ ماری کہ قریب تھا ان کی روح جسم سے جدا ہو جاتی۔

اصنافِ صابرین

بصرہ میں قیام کے دوران میں نے ابن سالم علیہ الرحمہ سے صبر کرنے والوں کے بارے میں سوال کای تو فرمایا: صبر کرنے والے تین طرح کے ہوتے ہیں۔ متصبر جو بتکلف صبر کرتے ہیں۔ دوسرے صابر جو فی الواقع صبر اختیار کرتے ہیں۔ اور تیسرے صبار جو بہت زیادہ صبر کرنے والے ہوتے ہیں۔

بتکلف صبر کرنے والا اللہ کے ذریعے صبر کرتا ہے۔ وہ بعض اوقات تو صبر اختیار کرتا ہے اور بعض اوقات اس سے عاجز ہوتا ہے۔ قناد علیہ الرحمہ نے کہا کہ جن چیزون سے منع کیا گیا ان سے باز رہنا اور جن کے اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ان پر ثابت

قدم رہنا صبر ہے۔

صابر کی یہ علامت ہے کہ وہ رضائی خدا کے لیے اختیار کرتا ہے۔ وہ کسی حالت میں بھی مصائب پر غم کا اظہار نہیں کرتا۔ مگر اس سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ فریاد کرے، جیسا کہ ذوالنون مصری علیہ الرحمہ کہتے ہیں کہ میں حالتِ مرض میں ایک صوفی کی عیادت کو گیا تو گفتگو کے دوران اس نے ایک دلدوز چیخ ماری اس پر میں نے اس سے کہا کہ وہ شخص محبت میں صادق نہیں جس نے مصیبت و دکھ میں صبر نہ کیا۔ اس کے جواب میں اس نے کہا: نہیں بلکہ یوں کہئے کہ وہ شخص سچا محب نہیں جس نے دکھ سے لذت حاصل نہ کی۔

اس ضمن میں شبلی علیہ الرحمہ کا ایک واقعہ ہے کہ جب انہیں شفا خانے میں داخل کیا گیا اور اس کے بعد کچھ احباب بغرض عیادت گئے تو انہوں نے پوچھا: تم کون لوگ ہو؟ انہوں نے کہا: آپ کے چاہنے والے، اس پر شبلی نے جواباً ان کی طرف اینٹیں پھینکیں اور وہ وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے اور آپ نے ان کو پکارا کہ اے محبت کے جھوٹے دعویدارو! کیا تم مجھ سے محبت کا دعویٰ کرتے ہو اور میرے دیئے ہوئے دکھ پر صبر تک نہیں کر سکتے۔

جہاں تک صابرین میں سے صنفِ صبار کا تعلق ہے۔ تو یہ درجہ اسی کو حاصل ہو سکتا ہے۔ جس نے اللہ کے ذریعے، اللہ ہی کے لیے اور اللہ کو ہی اپنا جاننے پر صبر اختیار کر لیا ہو۔ صبار یعنی انتہائی درجے کا صابر وہ ہوتا ہے کہ اگر مصائب کے پہاڑ بھی اس پر ٹوٹ پڑیں تو بھی اس کے ہاتھوں سے صبر کا دامن چھوٹنے نہیں پاتا۔ اور وہ ظاہری باطنی دونوں لحاظ سے غیر متزلزل رہتا ہے۔

ابوبکر شبلی علیہ الرحمہ صبر کی وضاحت میں اکثر یہ اشعار پڑھا کرتے تھے۔

ترجمہ اشعار:

(۱) آنسوؤں نے رخساروں پر جو سطریں رقم کیں وہ اس نے بھی پڑھ ڈالیں جو اچھی طرح پڑھ نہیں جانتا۔

(۲) اس میں کوئی شک نہیں کہ وارفتۂ الفت کی الم شوق و اندیشۂ فراق میں ڈھلی ہوئی صدا زبوں حالی و تنگی سے خالی نہیں ہوتی۔

(۳) محبت نے صبر کیا اور یہاں تک صبر کیا کہ خود صبر نے بھی دہائی دی اور محبت کا شیدائی پکار اٹھا کہ اے صبر! صبر کر۔

صبر کا ایک مقام یہ بھی ہے کہ جب حضرت زکریا علیہ السلام کے سر مبارک پر دشمنانِ خدا نے آرہ چلایا تو انہوں نے ایک دلدوز آہ نکالی اور اللہ نے وحی کی وساطت سے انہیں خبر دی کہ اے زکریا! اگر تیری دوسری آہ مجھ تک پہنچی تو میں تمام زمینوں اور آسمانوں کو ایک دوسرے پر الٹا دوں گا۔ ①

مقامِ توکل

کیا اعلیٰ مقام ہے توکل کا کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں ایمان کا ذکر کیا وہاں توکل کو بھی اس کے ساتھ ہی بیان فرمایا:

وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ [المائدہ:۲۳]

---

① اسرائیلیات میں سے ہے۔

ترجمہ: ''اور اللہ ہی پر بھروسہ کرو اگر تم مومن ہو۔''

اور فرمایا:

وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۝۱۲ ع[ابراھیم:۱۲]

ترجمہ: ''اور بھروسہ کرنے والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔''

مذکورہ آیاتِ مبارکہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے توکلِ متوکلین کو توکل مومنین سے مخصوص کیا اور پھر ایک مقام پر خاص الخاص توکل کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ [الطلاق: ۳]

ترجمہ: ''اور جو اللہ پر بھروسہ کرے تو وہ اسے کافی ہے۔''

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اس کے سوا کسی اور پر بھروسہ کرنے کی اجازت ہرگز نہیں دیتا جیسا کہ سید المرسلین و امام المتوکلین ﷺ سے خطاب فرمایا:

وَ تَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهٖ وَ كَفٰى[الفرقان:۵۸]

ترجمہ: ''اور بھروسہ کرو اس زندہ پر جو کبھی نہیں مرے گا اور اسے سراہتے ہوئے اس کی پاکی بیان کرو اور وہی کافی ہے۔''

اور فرمایا:

وَ تَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۝۲۱۷ الَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ۝۲۱۸[الشعرا:۲۱۸،۲۱۷]

ترجمہ: ''اور اس پر بھروسہ کرو جو عزت والا مہربانی والا ہے جو تمہیں دیکھتا ہے جب تم (نماز کے لیے) کھڑے ہوتے ہو۔''

درجاتِ توکل

توکل کے تین درجے ہیں۔ توکل عام، توکل خاص اور توکل خاص الخاص۔

پہلے درجے کی تعریف ابوتراب نخشبی علیہ الرحمہ کے الفاظ میں یوں ہے کہ توکل جسم کی عبودیت کا عادی بنانے اور قلب کو ربوبیت وکفایت پر مطمئن رکھنے کا نام ہے۔ یعنی بندے کو کچھ عطا ہو تو شکرِ خداوندی بجالائے اور اگر محروم رکھا جائے تو قضاء قادر پر صبر وشکر کے اطمینان سے بیٹھا رہے۔

توکل ام سے متعلق اقوال صوفیہ

ذوالنون مصری علیہ الرحمہ: تدبیر نفس کو ترک کرنے اور ہر طرح کے خوف وقوت سے بے نیاز رہنا ہی توکل ہے۔

ابوبکر زقاق علیہ الرحمہ: توکل یہ ہے کہ ساری زندگی کو فقط ایک دن سمجھ لیا جائے تاکہ کوئی آنے والا دن رہے اور نہ اس کا غم۔

رویم علیہ الرحمہ: توکل یہ ہے کہ اللہ کے بندے سے وعدے کا اعتبار کیا جائے۔

سہل بن عبداللہ علیہ الرحمہ تمام معاملات اللہ پر چھوڑ دینا ہی توکل ہے۔

توکل خاص اقوال صوفیہ کے آئینے میں

ابو العباس ابن عطاء علیہ الرحمہ: جس نے اللہ پر اس کے ماسوا کے لیے توکل کیا تو اس نے اللہ پر ہرگز توکل نہ کیا۔ توکل خاص تو یہ ہے کہ وہ اللہ پر اسی کے لیے اور اسی کے ذریعے ہو۔ اور اللہ پر توکل کو صرف مقامِ توکل پانے کی خاطر ہی اختیار کیا جائے۔

ابو یعقوب نہر جوری علیہ الرحمہ: توکل، اسبابِ دنیا و آخرت کی لذتوں سے محرومی اور نفس کی موت کا نام ہے۔

ابو بکر واسطی علیہ الرحمہ: توکل کی اصل فقر و فاقہ ہے۔ متوکل کو چاہیے کہ انتہائی خواہشات اور آرزوؤں کے ایام میں بھی توکل کو ترک نہ کرے۔ اور ساری زندگی، ایک لمحے کے لیے بھی اپنے توکل کی جانب متوجہ نہ ہو۔

سہل بن عبداللہ علیہ الرحمہ: توکل کی مثال اس چہرے کی مانند ہے کہ جس کے ظاہری خد و خال نہ ہوں اور توکل فقط ان لوگوں کا حصہ ہے جو اپنے نفس کو مار چکے ہوں اور عجز و انکساری کی ایسی کیفیت کے حامل ہوں کہ گویا وہ جیتے ہی اہل قبور ہیں۔

توکل خاص الخاص اور اقوالِ صوفیہ

ابو بکر شبلی علیہ الرحمہ: اللہ کے لیے خود کو اس طرح وقف کر دو کہ تیرا اپنا وجود باقی نہ رہے اور فقط ذاتِ الٰہ ہی باقی رہ جائے جس کو زوال نہیں۔

بعض صوفیہ نے تو یہاں تک کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے کوئی بھی حقیقتِ توکل کے اعلیٰ درجے تک نہیں پہنچ سکتا۔ کیونکہ کمال میں کمال حاصل کرنا فقط ذات حق تعالیٰ کا حصہ ہے۔

حضرت جنید علیہ الرحمہ: ہر حال میں اللہ پر بھروسہ کرنا توکل ہے۔

احمد بن ابی الحواری علیہ الرحمۃ سے ان کے شیخ نے فرمایا: اے احمد آخرت کے کئی راستے ہیں جن میں سے اکثر سے تیرے شیخ کو واقفیت ہے مگر ایک راستہ ایسا ہے کہ جس سے تیرا شیخ محروم ہے اور وہ ہے راہ توکل۔

بعض صوفیہ کا کہنا ہے کہ جس شخص نے توکل کا کاملاً حاصل کرنا ہو اُسے چاہیے کہ ایک قبر کھود کر خود کو اس میں دفن کر دے اور دنیا و مافیہا کو بھول جائے۔ اور جہاں تک حقیقتِ توکل بکمالہ جاننے کا تعلق ہے۔ تو اسے خلق میں سے کوئی بھی نہیں پا سکا۔

مقام رضا اور اہل رضا

مقامِ رضا کا ذکر قرآن میں اس طرح کیا گیا ہے:

رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ [البینہ:۸]

ترجمہ: ''اللہ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی۔''

اور فرمایا:

وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ [التوبة: ۷۲]

ترجمہ: ''اور اللہ کی رضا سب سے بڑی ہے۔''

مذکورہ آیات مبارکہ میں اللہ جل جلالہٗ نے بندوں سے راضی رہنے کے ذکر کو بندوں کے اس سے راضی رہنے کے ذکر

پر اولیت دی اور اس طرح اسے اہم ٹھہرایا۔

رضا اللہ کی جانب ایک دروازہ ہے اور دنیا میں ایک جنت کے برابر ہے۔ رضا یہ ہے کہ بندہ اللہ کے ہر حلم پر راضی رہے۔

رضا اور اقوالِ صوفیہ

جنید بغدادی علیہ الرحمہ: رضا اپنے اختیار سے دستبردار ہونے کا نام ہے۔

قناد علیہ الرحمہ: اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر سکون واطمینان اختیار کرنے کو رضا کہتے ہیں۔

ذوالنون مصری علیہ الرحمہ: اللہ کی قضا پر قلب کا مسرور ہو جانا رضا ہے۔

ابن عطا علیہ الرحمہ: رضا یہ ہے کہ بندہ قلب کو اللہ تعالیٰ کے دائمی اختیار کی طرف متوجہ رکھے کیونکہ وہی بہتر جانتا ہے کہ اس نے جو کچھ نتائج اپنے بندے کے لیے منتخب فرمائے ہیں وہ اس کے لیے مفید ہیں۔ اس لیے بندے کو ہر حال میں اپنے رب سے راضی رہنا چاہیے۔

ابو بکر واسطی علیہ الرحمہ: اپنی جدوجہد میں رضا کو حاکم بناؤ۔ ایسا نہ ہو کہ رضا کو خود پر مسلط کر کے اس کی لذتوں اور حقیقتوں سے محروم رہ جاؤ۔

طبقاتِ اہلِ رضا

اہل رضا کے تین طبقے ہیں۔ ایک طبقہ وہ ہے کہ وہ اپنے دکھ درد کے اظہار کو یکسر ختم کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ ان کے دل اللہ کی طرف سے ہر دکھ، غم، آزمائش، آسائش اور منع وعطا کو خوشی سے قبول کرتے ہیں۔

اہل رضا کا دوسرا طبقہ اللہ سے راضی رہنے کے احساس کو چھوڑ کر اللہ کے اس سے راضی رہنے کو ترجیح دیتا ہے۔ اور وہ اپنی خواہش اللہ کے اس قول کے مطابق کرتے ہیں کہ رضی اللہ عنهم و رضوا عنه اور چاہے تنگ دستی، خوشحالی اور منع وعطا کے حالات اس پر آ جائیں تو بھی وہ اللہ کے اس سے راضی رہنے پر اپنی رضا کو ترجیح نہیں دیتا۔

تیسرا طبقہ اہل رضا کا مذکورہ حدود سے بھی کہیں آگے بڑھا ہوا ہے۔ اس طبقے کے صوفیہ نے اللہ کی دائمی عنایت کو رضائے عبد اور رضائے الٰہی کی بنیاد ٹھہرایا۔

ابوسلیمان دارانی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں خلق کے اعمال ہی اللہ کو راضی یا ناراض نہیں کرتے بلکہ وہ جس سے راضی ہو جائے پھر اس سے ایسے کام لے لیتا ہے کہ وہ اس کی رضا کا باعث بن جاتے ہیں۔

احوال صوفیہ عظام علیہم الرحمہ

مراقبہ

حالِ مراقبہ کا ذکر ذیل کی ان آیاتِ مبارکہ میں موجود ہے۔

كَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ رَّقِيْبًا ۝ [الاحزاب:٥٢]

ترجمہ: ''اور اللہ ہر چیز پر نگہبان ہے۔''

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ۝ [ق:١٨]

ترجمہ: ''کوئی بات وہ زبان سے نہیں نکالتا کہ کہیں اس کے پاس ایک محافظ تیار نہ بیٹھا ہو۔''

اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَ نَجْوٰىهُمْ [التوبہ:٧٨]

ترجمہ: ''کہ اللہ ان کے دل کی پوشیدہ بات اور سرگوشی کو جانتا ہے۔''

وَ يَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ؕ [التغابن:٤]

ترجمہ: ''اور جانتا ہے جو کچھ تم چھپاتے اور ظاہر کرتے ہو۔''

مذکورہ بالا آیات کے علاوہ بھی کئی دیگر آیاتِ قرآنیہ میں حال مراقبہ کا ذکر موجود ہے۔ حضور سید الکونین ﷺ نے فرمایا:

> ''اللہ کی بندگی اس طرح بجالاؤ کہ گویا تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر تم اسے نہیں دیکھ پاتے تو یہی سمجھو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔'' ①

بندہ کا مراقبہ یہ ہے کہ وہ اس بات کا یقین کرے کہ اس کا رب اس کے باطن کو اچھی طرح جانتا ہے۔ اور اس کے ان تمام خیالات وتصورات سے بھی بخوبی آگاہ ہے جو اسے اپنے مالک حقیقی کی یاد سے دور رکھتے ہیں۔

ابو سلیمان دارانی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: اللہ سے دلوں کا حال کیسے پوشیدہ رہ سکتا ہے جب کہ دلوں میں جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ اللہ ہی کی جانب سے دلنشین کیا ہوا ہوتا ہے۔

جنید علیہ الرحمہ کا قول ہے: مجھ سے ابراہیم اجری علیہ الرحمہ نے کہا: اے لڑکے! اگر تو اپنے ارادے سے ذرا برابر بھی اللہ کی طرف لوٹا دے تو یہ سارے عالم سے بہتر ہے۔

حسن بن علی دامغانی علیہ الرحمہ کہتے ہیں اپنے باطن کی حفاظت کر کیونکہ تمہارے باطن کے معاملات سے اللہ تعالیٰ اچھی طرح باخبر ہے۔

اہل مراقبہ کے طبقات

اہل مراقبہ کے تین طبقے ہیں۔

---

① اس کی تخریج گزر چکی۔

پہلے طبقے کے لوگ جس طرح کے حال مراقبہ پر فائز ہوتے ہیں اس کا حال گزشتہ سطور میں حسن بن علی وامغانی کے قول میں بیان ہو چکا ہے۔

دوسرا گروہ اہل مراقبہ کا وہ ہے جس کے بارے میں احمد بن عطا علیہ الرحمہ نے فرمایا: تم میں سے بہترین وہ شخص ہے جس نے ماسوی اللہ کو فنا کر کے حق کو حق پر مراقب (نگہبان) ٹھہرایا اور اپنے اخلاق و اعمال اور آداب میں جناب ختم الرسل علیہ التحیۃ والسلام کی اتباع کی۔

تیسرے طبقے میں اکابر صوفیہ شامل ہوتے ہیں جو اللہ ہی پر اپنی توجہ مرکوز رکھتے ہیں اور اس عمل میں اللہ سے مدد مطلب کرتے ہیں۔ اور اللہ نے اس طرح کے اپنے مخصوص بندوں کو اس کرم سے نوازا ہے کہ تمام حالات میں وہ انہیں ان کے نفوس کے حوالے کرے گا اور نہ ہی انہیں کسی اور کا محتاج فرمائے گا۔ اور وہی ان کے تمام معاملات کی نگہبانی کرتا ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا:

وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ ۝ [الاعراف:١٩٦]

ترجمہ: ''اور وہ نیکیوں کو دوست رکھتا ہے۔''

ابن عطا علیہ الرحمہ نے خراسان کے کسی دانشور سے جو کہ جہالت کا شیدائی اور تقشف کو اپنائے ہوئے تھا یہ کہا: کیا تجھے معلوم نہیں کہ جو کچھ تو نے اپنے تن من پر مسلط کر رکھا ہے وہ تیرے پہلو میں ایک میل ہے جو برابر تیرے دل پر چڑھتا چلا جا رہا ہے اور تو اپنے باطن میں اس میل کی نگہبانی کر رہا ہے۔ تجھے تو چاہیے کہ اپنے ظاہر و باطن پر اپنے رب کو نگہبان بنائے کیونکہ اعمال و عبادات انجام دے کر انہیں اپنے ظاہر و باطن میں جگہ دے کر ان کی نگہبانی سے تو کہیں بہتر ہے کہ تو اپنے محبوبِ حقیقی جل جلالہٗ کو اپنے دل میں بسا کر اسی کا مراقبہ کرتا رہے۔

حالِ قرب

حالِ قرب کا ذکر مختلف آیاتِ قرآنی میں اس طرح ہوا ہے۔

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ [البقرہ:١٨٦]

ترجمہ: ''اور اے محبوب! جب تم سے میرے بندے مجھے پوچھیں تو میں نزدیک ہوں۔''

نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ۝ [ق:١٦]

ترجمہ: ''اور ہم شہ رگ سے بھی اس سے زیادہ قریب ہیں۔''

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ ۝ [الواقعہ:٨٥]

ترجمہ: ''اور ہم اس کے زیادہ پاس تم سے مگر تمہیں نگاہ نہیں۔''

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ [بنی اسرائیل:٥٨]

ترجمہ: ''وہ مقبول بندے جنہیں یہ کافر پوجتے ہیں وہ آپ ہی اپنے رب کی طرف وسیلہ ڈھونڈتے ہیں کہ ان میں کون زیادہ مقرب ہیں۔''

آخر الذکر آیت مبارکہ میں وسیلہ سے مراد قرب ہے۔ اور اس سے ماقبل کی آیت میں اللہ نے اپنے سے بندوں کے

قرب ہونے کا ذکر کیا۔ اور پھر بندوں کے اس سے قریب ہونے کو وسیلے کے معنیٰ میں بیان فرمایا:

مشاہدہ کرنے والے بندے کے حالِ قرب کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ اللہ سے اس کا قلب قریب ہوتا ہے۔ اور یہ قرب اسے اطاعتِ خداوندی اور ظاہراً و باطناً بارگاہ رب العزت میں ہمہ وقت اس کا ذکر کرتے ہوئے اپنے ارادے سے پیش کرنے کے باعث حاصل ہوتا ہے۔

درجاتِ قرب

قرب کے تین درجے ہیں۔

پہلا درجہ یہ ہے کہ بندہ طرح طرح کی اطاعتیں کر کے اور یہ جانتے ہوئے کہ اللہ اس سے بہت قریب اور اس پر قادر ہے، قربِ الٰہی کی دولت سے مالا مال ہوتا ہے۔

متقربین میں سے کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں مذکورہ حالت پر استقامت حاصل ہوتی ہے۔ جیسا کہ عامر بن عبداللہ فرماتے ہیں: میں نے کوئی چیز ایسی نہیں دیکھی کہ جس سے اپنے بجائے اللہ کو قریب تر نہ دیکھا ہو۔ ملاحظہ ہوں اسی ضمن میں چند اشعار۔

ترجمہ اشعار:

① مین نے تجھ کو اپنے نہاں خانہ دل میں پایا تو میری زبان نے تجھ سے سرگوشیاں کیں۔ گویا ہم کچھ اوصاف میں اکٹھے ہو گئے اور کچھ میں جدا۔

② اگرچہ تیری عظمتِ شان نے تجھ کو میری نظروں سے اوجھل رکھا تاہم وجد نے تجھے میری آنتوں یعنی باطن کے قریب کر دیا۔

قرب کے دوسرے درجے کے بارے میں جنید بغدادی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: واضح رہے کہ اللہ اپنے بندوں کے قلوب سے اسی قدر قریب ہوتا چلا جاتا ہے کہ جس قدر ان کے قلوب اس سے قریب ہوتے جاتے ہیں۔ لہٰذا تو اس جانب دھیان کر کہ تیرے قلب کے قریب کیا ہے؟

ایک صوفی کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ہیں کہ وہ ان سے اسی قدر قریب ہوتا ہے جتنا کہ وہ اس سے قریب ہوتے ہیں۔

قرب کے تیسرے درجے میں اکابر صوفیہ شامل ہوتے ہیں۔ اور اس کی وضاحت ابوالحسین نوری علیہ الرحمہ کے اس قول سے ہوتی ہے جو انہوں نے ایک ملاقاتی سے بیان فرمایا: ملاقاتی سے آپ نے پوچھا کہاں سے آئے ہو؟ اس نے جواب دیا بغداد سے۔ آپ نے کہا: بغداد میں کس کی صحبت میں رہے ہو۔ وہ بولا: ابوحمزہ کی صحبت میں، آپ نے اس سے فرمایا جب تو بغداد جائے تو ابوحمزہ سے کہنا کہ جسے ہم قرب القرب سمجھتے رہے ہیں وہ دراصل بعد البعد ہے۔

اسی مفہوم کو ابو یعقوب السوسی علیہ الرحمہ یوں بیان کرتے ہیں: جب تک بندے کو قرب کا احساس رہتا ہے قرب باقی نہیں رہتا۔ اور جب وہ قرب کی کیفیت پر فائز ہوتے ہوئے خود کو قرب سے منفی کر دیتا ہے تب اسے قرب حاصل ہوتا ہے۔ اور وہ اللہ سے قریب ہو جاتا ہے۔

محبت

محبت احوال صوفیہ میں سے محبت ایک اہم حال ہے۔ جس کا ذکر مختلف آیات مبارکہ میں کیا گیا ہے۔

قول عز وجل:

فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ [المائدة:٥٤]

ترجمہ: ’’تو عنقریب اللہ ایسے لوگ لائے گا کہ اللہ ان سے محبت کرے گا اور وہ اللہ سے۔‘‘

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ[آل عمران:٣١]

ترجمہ: ’’اے محبوب تم فرما دو لوگو! اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میرے فرمانبردار ہو جاؤ اور اللہ تعالیٰ تمہیں دوست رکھے گا۔‘‘

اور فرمایا:

يُحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ [البقرہ:١٦٥]

ترجمہ: ’’وہ ان (معبودوں) کو اللہ کی طرح محبوب رکھتے ہیں۔ اور ایمان والوں کو اللہ کے برابر کسی سے محبت نہیں۔‘‘

پہلی آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے بندوں سے اپنی محبت کا ذکر بندوں کی اس سے محبت کے ذکر سے پہلے فرمایا۔

دوسری آیت کریمہ میں بندوں کی اِس سے محبت اور اس کی بندوں سے محبت بیان کی گئی ہے۔

تیسری آیت مبارکہ میں بندوں کی اس سے محبت کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

جو بندہ حال محبت پر فائز ہوتا ہے وہ اللہ کے عطا کردہ انعامات کا اپنی چشم بصیرت سے ادراک کرتا ہے۔ قرب معبود کو ہمہ وقت قلب میں موجود پاتا ہے اور قلب میں اس کی عنایت، حفاظت، ہدایت اور قدیمی محبت کو محسوس کرتا ہے۔ جس بندے کو اس طرح کی کیفیات حاصل ہوں بلا شبہ اس نے کماحقہٗ اللہ جل جلالہٗ سے محبت کی۔

[illegible] کے نتیجے میں رونما ہوتا

مناظرہ کے مطابق گفتگو کی ۔ اور جو مجادلہ کرنا چاہتے تھے ان سے اسی کے آداب کے مطابق پیش آئے ۔ اور اپنے مخالفین کا مقابلہ حتی دلائل وشواہد کے ساتھ کیا ۔ الغرض انھوں نے ہر بات موقع ومحل کی مناسبت سے کی ۔ ہر شرعی حد کو قائم رکھا، مختلف پیچیدہ اصطلاحات والفاظ کے معانی واضح کئے، مزید یہ وضاحت بھی کر دی کہ اوامر ونواہی میں سے کون سے احکامات ضروری ہیں کون سے مستحسن ہیں اور کون سے ترغیبی وترہیبی ہیں ۔ جن احکام میں اشکال تھا رفع کر دیا، عقدے کھول دیئے، قوانین واضح کر دیئے، شبہات زائل کر دیئے، اصول سے فروع کی تخریج کی، اجمال کی تشریح کی اور حدود دین کو اس احتیاط کے ساتھ بیان کیا کہ کوئی کمی باقی نہ رہی اور اس بات کی ہرگز گنجائش باقی نہ چھوڑی کہ کوئی شخص کسی کی تاویل وغیرہ میں آسکے (یعنی احکام کو بہت واضح کر کے بیان کیا ۔)

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہی فقہاء کا طائفہ ہی ہے جس نے مسلمانوں کے حدود وقوانین کی حفاظت کی ۔ اور یہی ہیں جن کا ذکر قرآن یوں کرتا ہے :

تو کیوں نہ ہوا کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک جماعت نکلے کہ دین کی سمجھ حاصل کریں ۔	فلولا نفر من کل فرقة منهم طائفة لیتفقهوا فی الدین ۔(۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

جس سے اللہ تعالی کوئی اچھا کام لینا چاہے اسے دین کی سمجھ عطا فرماتا ہے ۔(۲)

فقہاء کرام نے علوم فقہ میں مستقل تصنیفات چھوڑی ہیں ۔ اور ان میں مشہور ائمہ فن ہو گذرے ہیں جن کی امامت پر امت کا اجماع ہے ۔

اس بارے میں مزید کچھ کہنا باعث طوالت ہوگا ۔ بہر حال عقل مند کم سے ہی زیادہ کا کام لے سکتا ہے ۔

* * *

---

(۱) التوبہ : ۱۲۲

(۲) صحیح بخاری، کتاب العلم، باب ۱۰

انکار، درجات قرب، حقیقت توحید، منازلِ تعزیر، حقیقتِ بندگی، وجودِ عالم کو ازل کے ساتھ مٹانا (یعنی صرف ازل جو کہ اللہ کا حکم ذاتی ہے اور ہمارے وجود سے قبل بھی اسی طرح موجود تھا جیسے اب ہے کے ذریعے کائنات کے وجود کو جو بہرِ طور ازل کے مقابلے میں نیست ہے، فانی گردانا جائے ۔) قرب قدیم سے حادث کا معدوم ہو جانا عطا کرنے والے کے دیدار کی لقاء عطاء محسن کی فنائ اور احوال کو مقامات سے گذر، احساس مقصد کو احساس مقصود میں فنا کر دینا ، اور دشوار گذار تاریک راستوں کو طے کرنا یہ ہیں وہ موضوعات جو صوفیہ ہی کا حصہ ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جنھیں مذکورہ تمام موضوعات سے متعلق پیچیدگیوں کا علم ہے۔ خلوت ہو کہ جلوت وہ ہر وقت ان پر کاربند رہتے ہیں۔ اور ان کی آبیاری خونِ جگر سے کرتے ہیں۔ انھیں ان سے اس قدر آگہی حاصل ہوتی ہے کہ وہ ان کے ذائقے اور کمی بیشی کے بارے میں صحیح معلومات دے سکتے ہیں۔ وہ ان نکات و مسائل کے بارے میں کسی کے بے دلیل دعوے کو تسلیم نہیں کرتے۔ اور وہ ان میں سے غلط و صحیح کی پہچان رکھتے ہیں۔ یہ اجمالی گفتگو تفصیلات سے کہیں بڑھ کر ہے اور یہ کسی طرح بھی قرآن و سنت سے باہر نہیں۔ ان کے اہل لوگ اس کی سمجھ رکھتے ہیں۔ اور علماء ان کا انکار نہیں کرتے، مگر کچھ ظاہری علوم رکھنے والے اس علمِ تصوف کے قائل نہیں۔ کیونکہ وہ کتاب اللہ اور احادیثِ رسولؐ میں سے صرف ظاہری احکام ہی کا علم رکھتے ہیں۔ اور وہی کچھ جانتے ہیں جس سے وہ اپنے مخالفوں پر سبقت لے سکیں۔ اور یہ عمل آج ہمارے دور کے وہی لوگ اپناتے ہیں جو دنیوی جاہ و منصب اور شان و شوکت کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ بہت کم لوگ آپ کو ایسے ملیں گے جو تصوف میں مشغول رہنا چاہتے ہوں۔ کیونکہ اس میں جفاکشی اور محنت کرنا پڑتی ہے یہ گھٹنوں کو تھکا دیتا ہے اور دل میں درد کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ اس میں آنکھیں بھیگ جاتی ہیں، اور یہ چھوٹوں کو بڑا اور بڑوں کو چھوٹا بنا دیتا ہے۔ لوگ کب کوئی اس وادی میں قدم رکھنے کی ہمت کرتا ہے نفس کو اس کے حصول میں کوئی حظ نہیں آتا کیونکہ اس میں نفس کشی، دنیا و مافیہا سے بے خبری اور خواہشات سے کنارہ کشی اختیار کرنا پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علماء ظاہر اس علم (تصوف) کو ترک کر کے ایسے علم میں مشغول ہو گئے ہیں، جو انھیں دین میں بے جا گنجائش، تاویلات اور رخصت کی اجازت دے اور جو بشری لذتوں سے زیادہ قریب ہو اور عیش کوش طبائع پر بار نہ ہو۔

کا قرب حاصل کرنے والوں، اس پر توکل کرنے والوں اور ہر حال میں راضی رہنے والوں کے لیے جادۂ الفت کا پہلا قدم ہے۔ جس نے اس مقام پر فائز ہوتے ہوئے اپنی بنیاد مضبوط نہ کی وہ بعد میں آنے والے مقامات کی طرف ترقی نہ پا سکا۔ چونکہ حُبّ دنیا ہی تمام برائیوں کی جڑ ہے اور اس سے زہد اختیار کرنا ہی ہر بھلائی اور اطاعت کی نیو ہے۔ کہتے ہیں کہ جو دنیوی جاہ و حشمت سے محبت کرنے والے کے نام سے مشہور ہوا تو گویا وہ ہزار بُرے ناموں سے موسوم ہوا اور جسے دنیا سے زہد یعنی کنارہ کشی) اختیار کرنے والے کے نام سے پکارا جائے تو گویا اسے ہزار اچھے ناموں سے یاد کیا گیا۔ اور زہد کا حلال سے گہرا تعلق ہے کیونکہ حلال اختیار کرتے وقت مشکوک اور حرام چیزوں سے پرہیز کرنا ہوتا ہے۔

طبقاتِ زہّاد

زہاد کے تین طبقے ہیں۔ پہلے طبقے کے زہاد کوئی دنیوی ملکیت نہیں رکھتے! اور جس چیز سے ان کے ہاتھ خالی ہوتے ہیں اس سے ان کے دل بھی خالی ہوتے ہیں یعنی وہ دل میں بھی کسی دنیوی ملکیت کی خواہش نہیں رکھتے۔ جیسا کہ جنید بغدادی علیہ الرحمہ کا قول ہے: زہد ہاتھوں اور دلوں کا طمع سے پاک ہونا ہے۔ سری سقطی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: جن چیزوں سے ہاتھ خالی ہوں ان سے دل بھی خالی ہوں تو زہد کی دولت حاصل ہوتی ہے۔

دوسرے طبقے میں وہ زہاد شامل ہیں جنھیں زہد میں انتہائی رسوخ اور استقلال حاصل ہوتا ہے۔ رُوَیم علیہ الرحمہ ان کے بارے میں کہتے ہیں: دنیا میں جو کچھ ہے اس کی خواہش سے نفس کو روکنا صرف زہد میں راسخ و ماہر صوفیہ ہی کا حصہ ہے۔ کیونکہ خود ترکِ دنیا میں بھی زاہد کو ایک طرح کی نفسانی لذت محسوس ہوتی ہے وہ اس طرح کہ لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں۔ اس کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اور اسے شہرت حاصل ہوتی ہے۔ الغرض جس نے دل کی گہرائیوں سے ان تمام لذات سے کنارہ کشی یعنی زہد اختیار کیا وہی راسخ و ماہر زہاد میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

زہاد کا تیسرا طبقہ ان صوفیہ پر مشتمل ہے جن کو اس بات کا علم اور یقین ہوتا ہے کہ اگر ساری دنیا ان کی ملکیت اور ان کے لیے حلال قرار دے دی جائے اور انھیں اس پر کسی طرح کے محاسبے کا بھی خطرہ نہ ہو اور وہ بھی جان لیں یہ کہ ایسی حالت میں اللہ کے ہاں ان کے مقام میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی تب بھی وہ دنیا میں زہد ہی کو اختیار کئے رکھیں۔ گویا ان کے زہد کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ جب

اصنافِ صابرین

بصرہ میں قیام کے دوران میں نے ابن سالم علیہ الرحمہ سے صبر کرنے والوں کے بارے میں سوال کیا تو فرمایا: صبر کرنے والے تین طرح کے ہوتے ہیں، متصبر جو بتکلف صبر کرتے ہیں دوسرے صابر جو فی الواقع صبر اختیار کرتے ہیں۔ اور تیسرے صبّار جو بہت زیادہ صبر کرنے والے ہوتے ہیں۔ بتکلف صبر کرنے والا اللہ کے ذریعے صبر کرتا ہے۔ وہ بعض اوقات تو صبر اختیار کرتا ہے اور بعض اوقات اس سے عاجز ہوتا ہے۔ قنّاد علیہ الرحمہ نے کہا کہ جن چیزوں سے منع کیا گیا ان سے باز رہنا اور بن کے اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ان پر ثابت قدم رہنا صبر ہے۔

صابر کی یہ علامت ہے کہ وہ للہ فی اللہ صبر اختیار کرتا ہے۔ وہ کسی حالت میں بھی مصائب پر غم کا اظہار نہیں کرتا۔ مگر اس سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ فریاد کرے، جیسا کہ ذوالنون مصری علیہ الرحمہ کہتے ہیں کہ میں حالتِ مرض میں ایک صوفی کی عیادت کو گیا تو گفتگو کے دوران اس نے ایک دلدوز چیخ ماری اس پر میں نے اس سے کہا کہ وہ شخص محبت میں صادق نہیں جس نے مصیبت و دکھ میں صبر نہ کیا۔ اس کے جواب میں اس نے کہا: نہیں بلکہ یوں کہئے کہ وہ شخص سچا محب نہیں جس نے دکھ سے لذت حاصل نہ کی۔

اس ضمن میں شبلی علیہ الرحمہ کا ایک واقعہ ہے کہ جب انھیں شفاخانے میں داخل کیا گیا اور اس کے بعد کچھ احباب بغرضِ عیادت گئے تو انھوں نے پوچھا، تم کون لوگ ہو؟ انھوں نے کہا: آپ کے چاہنے والے، اس پر شبلی نے جواباً ان کی طرف اینٹیں پھینکیں اور وہ وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے اور آپ نے ان کو پکارا کہ اے محبت کے جھوٹے دعویدارو! کیا تم مجھ سے محبت کا دعویٰ کرتے ہو اور میرے دیئے ہوئے دکھ پر صبر تک نہیں کر سکتے۔

جہاں تک صابرین میں سے صنفِ صبّار کا تعلق ہے۔ تو یہ درجہ اسی کو حاصل ہو سکتا ہے۔ جس نے اللہ کے ذریعے، اللہ ہی کے لیے اور اللہ کو ہی اپنا جاننے پر صبر اختیار کر لیا ہو۔ صبار یعنی انتہائی درجے کا صابر وہ ہوتا ہے کہ اگر مصائب کے پہاڑ بھی اس پر ٹوٹ پڑیں تو بھی اس کے ہاتھوں سے صبر کا دامن چھوٹنے نہیں پاتا۔ اور وہ ظاہری باطنی دونوں لحاظ سے غیر متزلزل رہتا ہے۔

ابن عطا علیہ الرحمہ: رضا یہ ہے کہ بندہ قلب کو اللہ تعالیٰ کے دائمی اختیار کی طرف متوجہ رکھے کیونکہ وہی بہتر جانتا ہے کہ اس نے جو کچھ نتائج اپنے بندے کے لیے منتخب فرمائے ہیں وہ اس کے لیے مفید ہیں۔ اس لیے بندے کو ہر حال میں اپنے رب سے راضی رہنا چاہیئے۔

ابوبکر واسطی علیہ الرحمہ: اپنی جد وجہد میں رضا کو حاکم بناؤ۔ ایسا نہ ہو کہ رضا کو خود پر مسلط کر کے اس کی لذتوں اور حقیقتوں سے محروم رہ جاؤ۔

طبقاتِ اہلِ رضا

اہل رضا کے تین طبقے ہیں۔ ایک طبقہ وہ ہے کہ وہ اپنے دکھ درد کے اظہار کو یکسر ختم کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں یہاں تک، کہ ان کے دل اللہ کی طرف سے ہر دکھ، غم، آزمائش، آسائش اور منع وعطا کو خوشی سے قبول کرتے ہیں۔

اہل رضا کا دوسرا طبقہ اللہ سے راضی رہنے کے احساس کو چھوڑ کر اللہ کے اس سے راضی رہنے کو ترجیح دیتا ہے۔ اور وہ ایسی خواہش اللہ کے اس قول کے مطابق کرتے ہیں کہ "رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ" اور چاہے تنگ دستی، خوشحالی اور منع وعطا کے حالات اس پر آجائیں تو بھی وہ اللہ کے اس سے راضی رہنے پر اپنی رضا کو ترجیح نہیں دیتا۔

تیسرا طبقہ اہل رضا کا مذکورہ حدود سے بھی کہیں آگے بڑھا ہوا ہے۔ اس طبقے کے صوفیہ نے اللہ کی دائمی عنایت کو رضائے عبد اور رضائے الٰہی کی بنیاد ٹھہرایا۔

ابوسلیمان دارانی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں خلق کے اعمال ہی اللہ کو راضی یا ناراض نہیں کرتے بلکہ وہ جس سے راضی ہو جائے پھر اس سے ایسے کام لے لیتا ہے کہ وہ اس کی رضا کا باعث بن جاتے ہیں۔

ایک صوفی کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ہیں کہ وہ اُن سے اسی قدر قریب ہوتا ہے جتنا کہ وہ اس سے قریب ہوتے ہیں۔

قرب کے تیسرے درجے میں اکابر صوفیہ شامل ہوتے ہیں۔ اور اس کی وضاحت ابوالحسین نوری علیہ الرحمہ کے اس قول سے ہوتی ہے جو انھوں نے ایک ملاقاتی سے بیان فرمایا، ملاقاتی سے آپ نے پوچھا کہاں سے آئے ہو؟ اس نے جواب دیا بغداد سے۔ آپ نے کہا: بغداد میں کس کی صحبت میں رہے ہو۔ وہ بولا: ابوحمزہ کی صحبت میں، آپ نے اس سے فرمایا جب تو بغداد جائے تو ابوحمزہ سے کہنا کہ جسے ہم قرب القرب سمجھتے رہے ہیں وہ دراصل بعد البعد ہے۔

اسی مفہوم کو ابو یعقوب السوسی علیہ الرحمہ یوں بیان کرتے ہیں: جب تک بندے کو قرب کا احساس رہتا ہے قرب باقی نہیں رہتا۔ اور جب وہ قرب کی کیفیت پر فائز ہوتے ہوئے خود کو قرب سے منفی کر دیتا ہے تب اسے قرب حاصل ہوتا ہے۔ اور وہ اللہ سے قریب ہو جاتا ہے۔

محبت

احوال صوفیہ میں سے محبت ایک اہم حال ہے۔ جس کا ذکر مختلف آیات مبارکہ میں کیا گیا ہے۔

قولِ عز وجل:

فسوف یاتی اللہ بقوم یحبھم و یحبونہ(۱)	تو عنقریب اللہ ایسے لوگ لائے گا کہ اللہ ان سے محبت کرے گا اور وہ اللہ سے۔

اور فرمایا:

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ(۲)	اے محبوب تم فرما دو لوگو! اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میرے فرمانبردار ہو جاؤ اللہ تمہیں دوست رکھے گا۔

---

(۱) المائدۃ: ۵۴
۵

(۲) آلِ عمران: ۳۱
۳

اس بات سے اللہ کا خوف رکھتے ہیں کہ کہیں وہ اپنے نفس پر شفقت نہ کر بیٹھیں اور اس بات سے بھی ڈرتے ہیں کہ کہیں وہ کوئی ایسا عمل نہ کر بیٹھیں جو انھیں حکم خداوندی سے دور لے جائے ۔

ابن خبیق علیہ الرحمہ نے کہا : میرے نزدیک خوف خدا رکھنے والا وہ ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ خوف و امن کی حالت میں رہے جیسا کہ ایک وقت میں مخلوق اللہ کا خوف رکھتی ہے تو ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ اللہ اسے مطمئن اور مامون فرما دیتا ہے ۔

قتادہ علیہ الرحمہ کا قول ہے : علامتِ خوف یہ ہے کہ بندہ اپنے نفس کو کسی نیک کام کے زمانۂ حال میں کرنے کے بجائے مستقبل قریب میں انجام دینے کی بیماری نہ لگائے ۔

بعض صوفیہ کا خیال ہے کہ ہیجانِ قلوب اور ترہیب سے خوف رکھنا ہی علامت خوف ہے ۔

ابن خبیق علیہ الرحمہ نے کہا : میرے نزدیک خائف وہ ہے جو شیطان سے اس قدر خوف نہ رکھے جس قدر کہ خود اپنے نفس سے ڈرے ۔

خوف خدا رکھنے والوں میں جو لوگ طبقۂ خواص سے تعلق رکھتے ہیں ان کے خوف کی کیفیت سہل بن عبداللہ علیہ الرحمہ کے اس قول سے معلوم ہوتی ہے ۔ جس میں وہ فرماتے ہیں :

اللہ کا خوف رکھنے والے بندوں کے خوف میں سے ایک ذرہ بھی سارے عالم کے لوگوں میں تقسیم کر دیا جائے تو یہ ان کی نجات کا سامان ہو جائے ۔ ان سے اس بارے میں جب سوال کیا گیا کہ اس درجہ کا خوف رکھنے والوں کے پاس کس قدر خوفِ خدا ہوتا ہے تو فرمایا : پہاڑ برابر ۔

ابن جلاّ علیہ الرحمہ نے فرمایا : خوف خدا رکھنے والا اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا ۔

ابوبکر واسطی علیہ الرحمہ کہتے ہیں کہ خوف کے اعلیٰ درجے پر فائز بندے فراقِ محبوب سے لرزاں رہتے ہیں جب کہ نچلے درجے والے پر خوفِ عذاب طاری ہوتا ہے ۔ اور اعلیٰ درجے کا خوف پانا تو بہت دور کی منزل ہے ۔ کیونکہ جب تک نفس میں کسی طرح کی بھی رعونتیں باقی رہیں خوف کا یہ مقام حاصل ہونا ممکن نہیں ۔

تیسرے مقام پر وہ اہلِ شوق فائز ہوتے ہیں جو قربِ محبوب کا اس طرح مشاہدہ کر رہے ہوتے ہیں کہ گویا وہ ان کے سامنے ہے غائب نہیں اور اسی کیفیت میں وہ اس کے ذکر سے دل کو فرحاں وشاداں پاتے ہیں۔

مقامِ مذکور کے اہلِ شوق کہتے ہیں کہ شوق تو غائب کے لیے ہوتا ہے جب کہ اللہ عزوجل کی ذات اقدس حاضر ہے غائب نہیں۔ تو ایسے میں احساسِ شوق نہیں رہتا۔ گویا ایسے لوگ مشتاق ہیں بلا شوق کے اور احساسِ شوق کا کھو دینا ہی انھیں دوسرے اہلِ شوق سے ممتاز کرتا ہے۔

اُنس

اللہ سے انس رکھنے کا مفہوم اس پر اعتماد کرنا، اس سے خوش ہونا اور اس سے اعانت طلب کرنا ہے۔ اس کے علاوہ انس کی مزید کوئی تشریح نہیں کی جا سکتی۔

ایک خبر میں ہے کہ مُطرف بن عبداللہ بن الشخر رحمۃ اللہ علیہ (یہ کبار تابعین میں سے تھے) نے حضرت عمر بن عبدالعزیز علیہ الرحمہ کو لکھا: تجھے فقط اللہ ہی کے ساتھ انس رکھنا چاہیئے۔ اور اسی کی صحبت میں رہنا چاہیئے۔ کیونکہ جو اللہ کے بندے ہیں وہ اللہ ہی کے ساتھ انس رکھتے ہیں بلکہ وہ اپنی خلوت میں جلوت سے بڑھ کر اللہ سے انس رکھتے ہیں۔ اور جو لوگ بہت زیادہ نفرت کرنے والے ہوں وہ انتہائی انس رکھنے والے ہوتے ہیں۔ اور جو لوگ انتہائی انس رکھنے والے ہوتے ہیں وہ بہت زیادہ نفرت کرنے والے ہوتے ہیں۔

کسی نامعلوم عارف علیہ الرحمہ نے انس کے بارے میں کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ایسے ہیں جنہیں اس نے حقیقی انس کے مقام پر فائز کرنا چاہا تو انھیں اپنے ماسوا کے خوف سے باز رکھا۔

اللہ کے ساتھ انس رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ بندے کی طہارت مکمل ہو اور اللہ کا ذکر خالص طور پر کرتا ہو وہ ہر اس شے سے نفرت کرتا ہو جو اسے محبوب سے غافل کرے اور اس کے نتیجے میں اللہ اس سے انس رکھتا ہو۔

ابوسعید خراز علیہ الرحمہ نے فرمایا: جس نے اپنے قلب سے ذاتِ حق کا مشاہدہ کیا۔ اس سے ماسوا اللہ سب کچھ منفی ہو گیا۔ اور عظمتِ وجود باری تعالیٰ کے سامنے کسی اور شے کا وجود معدوم ہو گیا! اور قلب میں فقط وجودِ حق ہی باقی رہ گیا۔

عمر بن عثمان مکی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: جو چیز قلوب کو غیب سے غیب[1] کے ذریعے حاصل ہو اور اسے نہ تو عیاں کیا جا سکے اور نہ وجد[2] سمجھا جا سکے اسے مشاہدہ کہتے ہیں۔ مزید فرمایا کہ مشاہدہ قلب کے ذریعے رؤیتِ حق کو حاصل کرنے اور رؤیت عیاں کے اتصال کو کہتے ہیں کیونکہ قلب کے ذریعے رویت تو کشفِ یقین کی کثرت کے سامنے فقط ایک توہم ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے فرمایا تھا کہ "اللہ کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا تم اسے دیکھ رہے ہو"۔

آیت مبارکہ کے الفاظ 'وہو شہید' کی وضاحت میں صوفیہ کرام کہتے ہیں کہ شہید سے بچشم عبرت اشیاء کا مشاہدہ کرنے والا اور بچشم غور و فکر ان کا معائنہ کرنے والا مراد ہے۔

عمرو مکی علیہ الرحمہ نے فرمایا: مشاہدہ خلق سے غائب اور اللہ کے حضور حاضر رہنے کو کہتے ہیں۔ اور اسی حضور کو قربِ الٰہی سے تعبیر کیا جاتا ہے جیسا کہ اللہ جل ذکرہ نے فرمایا:

وسئلهم عن القرية التى كانت	اور ان سے حال پوچھو اس بستی کا کہ دریا
حاضرة البحر[3]	کے کنارے تھی۔

آیت کریمہ میں 'حاضرۃ البحر' کا معنی قریبۃ البحر (دریا سے قریب) ہے اور قریبۃ البحر کا مطلب 'شاہدۃ البحر' (دریا کا مشاہدہ کرنے والی) ہے۔

---

(۱) اصطلاح صوفیہ میں جس عالم کی طرف اللہ تعالیٰ انسان کے واسطے کے بغیر نظر کرتا ہے۔ غیب کہلاتا ہے (مترجم)

(۲) وجد: ایسی حقیقی کیفیات جو اس وقت قلب پر وارد ہوں جب کہ قلب شہود (مشاہدہ حق تعالیٰ) میں فانی ہو۔ (مترجم)

(۳) الاعراف: ۱۶۳

✓

سے خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ
اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ
وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ (۱)

تو انھیں ان کا ساتھ ملے گا جن پر اللہ نے
فضل کیا یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہدا اور
نیک لوگ۔

شہدا انھیں کہتے ہیں جو اپنی جانیں رب کے ہاتھ بیچ ڈالیں اور صالحین سے مراد وہ بندے ہیں جو اپنی امانتوں اور وعدوں کے محافظ رہتے ہیں۔

* * *

---

(۱) النساء : ۶۹ ہم

اہلِ فہم کہتے ہیں کہ قلبِ سلیم سے مراد وہ دل ہے جس میں بجز ذاتِ لم یزل کے کچھ نہ ہو۔

سہل بن عبداللہ علیہ الرحمہ کہتے ہیں: اگر بندے کو قرآن حکیم کے ہر حرف کے ہزار مطالب عطا کئے جائیں تو بھی وہ قرآن کریم کی کسی ایک آیت کے معانی کو پوری طرح نہیں جان سکتا اس لیے کہ قرآن، کلامِ الہی ہے اور اس کی صفت۔ جس طرح اس کی کوئی انتہا نہیں اسی طرح اس کی صفت کی بھی کوئی حد نہیں۔ کلامِ الہٰی کا علم اولیاء اللہ کو اسی قدر عطا ہوتا ہے جس قدر ان کا رب چاہتا ہے۔

اللہ کا کلام غیر مخلوق ہے اور اس کے معانی و مطالب کا کامل حصول خلق کے بس میں نہیں کیونکہ ان کے اذہان حادث[1] اور مخلوق ہیں۔

دعوت[2] و اصطفا

سہل بن عبداللہ علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: دعوت عام ہے جب کہ ہدایت خاص، اور آپ نے اس ضمن میں اس آیت مبارکہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے:

وَاللّٰہُ یَدْعُوْٓا اِلٰی دَارِ السَّلٰمِ وَیَھْدِیْ	اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف پکارتا ہے
مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ[3]	اور جسے چاہے سیدھی راہ چلاتا ہے۔

اوپر کی سطور میں مذکور آیت مبارکہ میں دعوت عام ہے اور ہدایت خاص کیونکہ ہدایت سے مراد اللہ کی جانب بڑھنا ہے۔ اور وہ لوگ جنہیں اللہ نے چن لیا اور انھیں عزیز جانا وہ ان لوگوں سے بلند مقام رکھتے ہیں جنہیں اس نے پکارا یا اپنی جانب دعوت دی۔

اصطفا کا ذکر جن آیات مبارکہ میں آیا ہے وہ ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ وَسَلٰمٌ عَلٰی	تم کہو سب خوبیاں اللہ کو اور سلام اس
عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی اللّٰہُ	کے چنے ہوئے بندوں پر کیا اللہ بہتر ہے

---

(۱): کسی شے کے حادث ہونے سے مراد اس کا اپنی ایجاد میں ایک موجدِ ازلی کا محتاج ہونا ہے (مترجم)

(۲): دعوت لغوی معنی: پکارنا، بلانا اصطفار، لغوی معنی: چننا، منتخب کرنا۔ اصطلاح صوفیہ میں اللہ تعالیٰ کا کسی کو صرف اپنی طرف راغب کر لینا اور بلانا دعوت کہلاتا ہے جب کہ کسی بندے کو چن لینے کو اصطفا کہتے ہیں۔

(۳): یونس: ۲۵

۱۴

مخاطبین کلامِ الٰہی کے درجات اور قبولِ خطاب میں ان کا باہمی تفاوت

مخاطبین کے تین درجات ہیں پہلے درجے میں وہ لوگ ہیں جنھوں نے خطاب الٰہی کو سنا اُسے قبول کیا اور اس کا اقرار کیا مگر عمل کرتے وقت دنیوی مفادات، اتباعِ نفس اور غفلت ان کے راستے میں رکاوٹ بن کر کھڑی ہو گئی۔ وہ دشمن (شیطان) کے جھانسے میں آگئے اور خواہشاتِ دنیا پر مر مٹے۔ انہی لوگوں کے بارے میں قرآن کریم کی مختلف آیات یوں گویا ہیں:

"اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰاهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ"(۱)	بھلا دیکھو تو وہ جس نے اپنی خواہش کو اپنا خدا ٹھہرا لیا۔ اور اللہ نے باوصف علم کے گمراہ کیا۔
"وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَلٰى ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰهُ"(۲)	اور اس کا کہا نہ مانو جس کا دل ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا اور وہ اپنی خواہش کے پیچھے چلا۔
"خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ"(۳)	اے محبوب! معاف کرنا اختیار کرو۔ اور بھلائی کا حکم دو۔
"زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ	لوگوں کے لیے آراستہ کی گئی ان خواہشوں

---

(۱) الجاثیۃ: ۲۳ ۲۵ (۲) الکہف: ۲۸ ۱۸

(۳) الاعراف: ۱۹۹ ۷

۱۵

سماعت قرآن حکیم کے ذریعے اخذ اسرار و معانی

سماعت قرآن کے تین طریقے

یہ ذہن نشین رہے کہ پوری توجہ سے قرآن مجید کو سننے کے تین طریقے ہیں جو مجھ تک ابوسعید خراز علیہ الرحمہ سے پہنچے ہیں۔ پہلا طریقہ یہ ہے کہ قرآن کریم کو اس طرح سنا جائے کہ گویا خود حضور رسالت مآب علیہ التحیۃ والسلام تلاوت فرما رہے ہیں اور بندہ سن رہا ہے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اسے اس طرح سنا جائے کہ گویا جبریل علیہ السلام، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو تلاوت کر رہے ہیں جیسا کہ ارشادِ حق تعالیٰ ہے:

"وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ"(۱)	اور بے شک یہ قرآن رب العالمین کا اتارا ہوا ہے۔ اسے روح الامین لے کر اترا تمہارے دل پر۔

تیسرا طریق یہ ہے کہ تو اس طرح سنے کہ گویا خود ذات حق تعالیٰ سے براہِ راست سن رہا ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا:

"وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ"(۲)	اور ہم قرآن میں اتارتے ہیں وہ چیز جو ایمان والوں کے لیے شفا اور رحمت ہے۔
تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ(۳)	کتاب اتارنا ہے اللہ عزت و حکمت والے کی طرف سے۔

---

(۱) الشعراء: ۱۹۲ - ۱۹۴ (۲) بنی اسرائیل: ۸۲ (۳) الزمر: ۱

۲۶ ۱۷ ۳۹

مذکورہ دونوں آیات کو سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے تو خشیت و اشفاق کا ذکر فرمایا ہے اور دوسری آیت میں ایمان کا ذکر ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ خشیت و اشفاق کی کیفیت ایمان سے پہلے تھی بلکہ اس کیفیت سے پہلے وہ اللہ پر ایمان رکھتے تھے اور ان کے دلوں میں یہ خیال موجود تھا کہ اللہ تعالیٰ خشیت و اشفاق کی کیفیت سے نواز کر انھیں ایمان میں اور پختہ کرنا چاہتا ہے۔

جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و نبوت کے ذکر کے بعد ان کے ایمان کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

"فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ	تو ایمان اللہ کے رسول اور بے پڑھے غیب
الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ"(١)	بتانے والے پر کہ (جو) اللہ اور اس کی باتوں
	پر ایمان لاتے ہیں۔

اہلِ دانش (صوفیہ کرام) نے مذکورہ آیت کریمہ سے یہ مفہوم اخذ کیا ہے کہ ایمان کے بڑھنے کی کوئی حد نہیں اور اہلِ حق اپنے آغاز سے انجام تک ایمان کی حقیقتوں کو پاتے رہتے ہیں، مگر ان میں سے کوئی اس کی آخری حد تک نہیں پہنچا کیونکہ اس کی کوئی آخری حد ہی نہیں۔

پھر فرمایا:

"وَالَّذِيْنَ هُمْ بِرَبِّهِمْ لَا يُشْرِكُوْنَ"(٢)	اور وہ جو اپنے رب کا کوئی شریک نہیں کرتے۔

اللہ نے اپنے بندوں کو خشیت، اشفاق اور ایمان سے متصف کرنے کے بعد یہ فرمایا کہ وہ اپنے رب کے ساتھ کبھی کوئی شریک نہیں ٹھہراتے۔

شرکِ خفی

مذکورہ بالا آیت میں شرک سے مراد شرکِ خفی ہے۔ اور یہ وہ شرک ہے جو بندے کے دل میں اپنی عبادات اور ریاضات کی طرف متوجہ ہو جانے اور ان کا عوض پانے کے خیال کے جگہ پکڑنے سے پیدا ہوتا ہے، اور اگر بندہ ایمان کی واضح صورت کا حامل ہونے اور یہ جانتے ہوئے کہ اللہ کے سوا کوئی نفع و ضرر پہنچانے والا

---

(١) الاعراف: ١٥٨ (٢) المومنون: ٥٩

یہاں پر یہ نکتہ پیشِ نظر رہے کہ اللہ تعالیٰ بہت خوبصورت انداز میں فرماتا ہے کہ ابرار اپنی چمکتی پیشانی اور اپنی شراب میں چشمۂ تسنیم جیسے مبارک ترین چشمے کی شراب کی ملاوٹ کے باعث باقی اہلِ جنت سے تو ممتاز ہیں مگر وہ مقربین کے مقام سے آگے نہیں کیونکہ وہ اسی تسنیم سے سدا پیتے رہیں گے۔

اسی ذکر کو اور آیات میں بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"إِنَّ الْأَبْرَارَ يَشْرَبُونَ مِنْ كَأْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُورًا"(۱)

بے شک نیک پئیں گے اس جام میں سے جس کی ملونی کافور ہے۔

اور فرمایا:

"وَيُسْقَوْنَ فِيهَا كَأْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيلًا عَيْنًا فِيهَا تُسَمّٰى سَلْسَبِيلًا"(۲)

اور اس میں وہ جام پلائے جائیں گے جس کی ملونی ادرک ہوگی وہ ادرک کیا ہے جنت میں ایک چشمہ ہے جسے سلسبیل کہتے ہیں۔

انعاماتِ اہلِ جنت کے باب میں فرمایا:

"وَإِذَا رَأَيْتَ ثَمَّ رَأَيْتَ نَعِيمًا وَمُلْكًا كَبِيرًا"(۳)

اور جب تو ادھر نظر اٹھائے ایک چین دیکھے اور بڑی سلطنت۔

آیت مذکورہ میں انعاماتِ جنت کا ذکر فرماتے ہوئے ان کا وصف بیان نہیں کیا گویا وہ ایسی نعمتیں یاں جن کی کوئی صفت بیان ہی نہیں کی جاسکتی۔ اور مزید فرمایا:

"وَسَقَاهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُورًا"(۴)

اور انھیں ان کے رب نے ستھری شراب پلائی

یعنی جہاں کہیں بھی ابرار کے پینے کا ذکر آیا تو ملاوٹ والی شراب پینے کے ساتھ انھیں مخصوص کیا مگر جب بھی مقربین کے پینے کا ذکر فرمایا تو اس میں ملاوٹ کا تذکرہ نہیں کیا۔

ادراکِ حقائق اور استطاعت مومنین

فرمایا: "وَلَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا"(۵)

اور ہم کسی جان پر بوجھ نہیں رکھتے مگر اس کی طاقت بھر۔

---

(۱) الدھر: ۵ ٦ ٧ (۲) الدھر: ۱۷-۱۸ (۳) الدھر: ۲۰

(۴) الدھر: ۲۱ (۵) المؤمنون: ۶۲

۲۳

١٩

مطالب حروف و اسماء

وہ تمام افکار و نتائج جن تک علوم و اذہان نے رسائی حاصل کی ہے قرآن کریم کے دو جملوں بسم اللہ اور الحمد للہ سے نکلے ہیں۔ اور ان دونوں جملوں کا مفہوم بالترتیب "اللہ کے ذریعے" اور "اللہ کے لیے" ہے اس مفہوم میں یہ اشارہ موجود ہے کہ جو کچھ ذہن انسانی کے دائرے میں ہے وہ خود سے قائم نہیں بلکہ اللہ ہی سے اور اسی کے لیے ہے۔

باءِ بسم اللہ کی صوفیانہ تشریح

ابوبکر شبلی علیہ الرحمہ سے کسی نے پوچھا کہ بسم اللہ کی با میں کس طرف اشارہ ہے۔ تو فرمایا:

تمام ارواح و اجسام اور حرکات خود اپنی ذات میں قائم نہیں بلکہ اللہ کے ساتھ قائم ہیں۔

ابوالعباس بن عطار علیہ الرحمہ سے دریافت کیا گیا کہ عارفین کے دلوں کو کس چیز سے سکون ملتا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: اللہ کی کتاب کے پہلے حرف باءِ بسم اللہ سے۔ کیونکہ اس باء کا معنی ہے کہ اللہ ہی کے ذریعے اشیاء کا ظہور ہوتا ہے اور اسی سے وہ فنا ہوتی ہیں۔ اس کے جلوے سے آراستہ اور اسی کے عدمِ تجلی سے قبیح ہو جاتی ہیں۔

اس کے نام اللہ میں ہیبت و کبریائی الرحمٰن میں محبت و مودت اور الرحیم میں اس کی مدد اور فتح ہے بے شک اس کی ذات اعلیٰ صفات پاک ہے جس نے اپنے اسماء میں جدا جدا لطیف نکات پوشیدہ رکھے ہیں۔

نیکی و بدی کیا ہے؟

ابوالعباس ابن عطاء علیہ الرحمہ کے قول "اسی کے جلوے سے آراستہ" کا مطلب یہ ہے کہ کسی

ارشاد فرمایا :

"اَلَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ وَالَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ"(۱)	وہ جس نے مجھے پیدا کیا وہ مجھے راہ دے گا۔ اور وہ جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب میں بیمار ہوں تو وہی مجھے شفاء دیتا ہے۔

مذکورہ بالا آیت کریمہ کی تشریح کرتے ہوئے شاہ کرمانی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ آیت میں یہ فرمایا گیا کہ جس نے مجھے پیدا فرمایا وہی میری اپنی جانب رہنمائی کرتا ہے اور غیر کی طرف نہیں جانے دیتا۔ اور وہی ذات وحدہ لاشریک ہے جو مجھے اپنی رضا سے کھلاتا اور اپنی الفت کا جام پلاتا ہے۔ اور جب میں اپنے مشاہدۂ نفس کے نتیجے میں بیمار پڑ جاتا ہوں تو وہ مجھے اپنے مشاہدے کے ذریعے شفا عطا فرماتا ہے۔ وہی ہے جو مجھے میرے نفس سے مارتا اور اپنی ذات کے ساتھ زندہ کرتا ہے۔ گویا میں اسی کے ساتھ قائم ہوں نہ اپنی ذات کے ساتھ اور میں امید رکھتا ہوں کہ وہ مجھے اس روز شرمندہ نہیں فرمائے گا جب میں اس کے حضور اس حال میں کھڑا ہوں گا کہ میری نظر اپنے اعمال پر ہوگی اور پوری طرح اسی کا محتاج ہوں گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ حقیقت منکشف تھی کہ انھوں نے جو کچھ پایا وہ فقط اپنے رب کے فضل سے پایا۔ اور وہ جو کچھ بھی تمنا کریں گے صرف اسی کی رحمت بے پایاں ہی سے پائیں گے اسی کیفیت میں آپ نے یہ دعا فرمائی تھی۔

"رَبِّ هَبْ لِیْ حُکْمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ"(۲)	یارب مجھے حکم (حکمت وعلم) عطا کر اور مجھے ان سے ملا دے جو تیرے قربِ خاص کے سزاوار ہیں۔

قولِ باری تعالیٰ ہے :

"اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِکْرِ اللّٰهِ"(۳)	وہ جو ایمان لائے اور ان کے دل اللہ کی یاد سے چین پاتے ہیں۔

---

(۱) الشعرآء : ۷۸ - ۸۰ ۲۶

(۲) الشعرآء : ۸۳ ۲۶

(۳) الرعد : ۲۸ ۱۳

یعنی ہم ان کے ہر قول کو خواہشات سے پاک سمجھیں اور مزید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب کی تشریح میں فرمایا :

"هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ "(۱)	وہی ہے جس نے اَن پڑھوں انہی میں ایک رسول بھیجا کہ ان پر اس کی آیتیں پڑھتے ہیں اور انھیں پاک کرتے ہیں اور انھیں کتاب اور حکمت کا علم عطا فرماتے ہیں۔

اس آیت سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے یہ قرآن ہم تک پہنچا انھیں سے ہم نے قرآن اور حکمت سیکھی۔ یہاں حکمت سے مراد ان کی سنت آداب، اخلاق، افعال حقائق اور احوال ہیں۔ آپ نے ہمیں وہ سب کچھ پہنچایا جو آپ پر نازل ہوا اور جس کے پہنچانے پر آپ کو مامور کیا گیا۔

جیساکہ قرآن حکیم گویا ہے :

"يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ "(۲)	اے رسول پہنچا دو جو کچھ اتارا تمہیں تمہارے رب کی طرف سے ۔

اور اللہ نے تمام خلق کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا حکم دیتے ہوئے فرمایا :

"قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ "(۳)	تم فرماؤ حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا۔

اسی ضمن میں ایک اور مقام پر فرمایا :

"مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ "(۴)	جس نے رسول کا حکم مانا بے شک اس نے اللہ کا حکم مانا۔

امت کے ہر فرد کو چاہئے کہ جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عطا فرمائیں وہ بلا چون وچرا قبول

---

(۱) الجمعہ : ۲ ۶۲ (۲) المائدہ : ۶۷ ۵

(۳) النور : ۵۴ (۴) النساء : ۸۰

۲۲ م

۲۲

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خداداد بلند اخلاق و عادات

حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: میری تربیت اللہ نے فرمائی اور کیا خوب تربیت کی۔

فرمایا: مَیں تم میں سب سے بڑھ کر اللہ کو جاننے والا اور اس کا خوف رکھنے والا ہوں۔

فرمایا: مجھے اس بات کا اختیار دیا گیا تھا کہ جنسِ فرشتہ یا جنسِ انسان سے نبی بن کر آؤں۔ جبریل نے مجھے اشارۃً کہا: عاجزی اختیار کرلو۔ اس پر میں نے کہا: میں انسانی جنس میں سے نبی بننا چاہتا ہوں کہ مجھے بھوک بھی لگے اور سیری بھی حاصل ہو۔

فرمایا: میرے سامنے پوری کائنات کو پیش کیا گیا مگر میں نے انکار کر دیا۔

فرمایا: اگر میرے پاس کوہِ اُحد کے برابر سونا بھی ہوتا تو سارے کا سارا راہ خدا میں خرچ کر ڈالتا صرف اس قدر باقی رکھتا کہ قرضہ چکا لیتا۔

ایک روایت ہے کہ آپ نے کبھی اگلے روز کے لیے کچھ بچا کر نہ رکھا۔ صرف ایک بار زندگی میں سارے سال کے لیے خرچ اکٹھا کر لیا تاکہ عیال اور باہر سے آنے والے وفود کی مہمانداری پر خرچ کیا جا سکے۔

روایت ہے کہ آپ کے پاس کبھی ایک ہی وقت میں دو قمیضیں نہیں ہوتی تھیں۔ اور کبھی آپ کے لیے خصوصی طور پر کھانا نہیں چنا گیا۔ اور آپ دنیا سے اس حالت میں رخصت ہوئے کہ کبھی گندم کی روٹی سیر ہو کر نہیں کھائی اور آپ نے یہ طرزِ عمل اختیار رکھتے ہوئے اپنایا کوئی اضطراری کیفیت نہ

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

ہم نے ایک بکری ذبح کی اور صدقہ کر دی حتیٰ کہ صرف اس کے شانے باقی رہ گئے تو میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ساری بکری اللہ کی راہ میں صدقہ کر دی صرف شانے رہ گئے ہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا ساری بکری تو باقی رہ گئی صرف شانے ہی گئے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ مَا	قلم اور ان کے لکھے کی قسم تم اپنے رب کے
اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ	فضل سے مجنون نہیں اور ضرور تمہارے لیے
وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ	بے انتہا ثواب ہے۔ اور بے شک تمہاری
وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ"(۱)	خو بو بڑی شان کی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

بلا شبہ اللہ جل وجلالہ عمدہ اخلاق کو پسند فرماتا ہے۔ اور برے اخلاق کو ناپسند۔

آپ نے مزید فرمایا:

مجھے اچھے اخلاق سکھانے کے لیے بھیجا گیا۔

آپ کا خلق جن صفات پر مشتمل تھا وہ یہ ہیں:

"حیا، سخاوت، توکل، رضا، ذکر، شکر، حلم، صبر، عفو، صلح، نرمی، رحمت، مدارات، نصیحت، تمکین، وقار، تواضع، فقر منشی، جود وسخا، خضوع، قوت، شجاعت، اخلاص، صدق، زہد، قناعت، خشوع، خشیت، تعظیم، ہیبت، دعا، گریہ، خوف، رجا، پناہ ڈھونڈنا، شب بیداری، عبادت، جہاد اور مجاہدہ۔

روایت ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بنیادی طور پر ہمیشہ متفکر اور مغموم سے رہتے تھے، اور آپ کے سینے میں اس طرح کا جوش ہوتا تھا جیسے آگ پر رکھی دیگچی میں جوش پیدا ہوتا ہے۔

---

(۱) القلم: ۱-۴

آیت مذکورہ میں یہ خبر دی گئی کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو جو مالِ غنیمت عطا فرمایا وہ اللہ اور اس کے رسول کا ہے کہ وہ اسے مناسب طریق پر تقسیم کر دیں۔ اور خمس الخمس جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چاہیں عطا فرمائیں:

قرآن پر عمل پیرا ہونے والوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرنے والوں کے تین طبقے ہیں۔

ایک وہ جن کا تعلق دین میں دی گئی سہولتوں، رخصتوں اور مباحات وتاویلات سے ہے۔

دوسرے وہ جن کا تعلق دینی قوانین کے علم سے ہے۔

تیسرے وہ جن کا تعلق جہاں دینی قوانین کے علم سے ہے وہاں وہ اس سے آگے بھی نظر رکھتے ہیں اور ایسے احوال، اعمال، اخلاق اور حقائق تک خود کو پہنچاتے ہیں جن سے بندے کے ایمان میں انتہائی پختگی اور کمال پیدا ہوتا ہے جیسا کہ حدیث میں بیان ہوا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ ہر چیز کی ایک حقیقت ہوتی ہے تمھارے ایمان کی حقیقت کیا ہے؟ حارثہ نے عرض کیا: میں نے نفس کو دنیا سے کنارہ کش کر لیا، راتوں کو جاگا اور دن کو روزہ سے رہا آپ نے فرمایا تو نے حقیقت کو پالیا۔ اور اب اس پر ثابت قدم رہ یا آپ نے یہ فرمایا کہ ایک بندہ جس کا قلب اللہ نے منور فرما دیا۔

کہا جاتا ہے کہ تصوف سے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے۔ اس کی بنیاد چار حدیثیں ہیں ایک حدیث جبریل علیہ السلام جب انھوں نے آپ سے ایمان واحسان کے بارے میں سوال کیا اور آپ نے فرمایا: احسان یہ ہے کہ تو اس طرح اللہ کی عبادت کرے کہ گویا تو اسے دیکھ رہا ہے۔

دوسری حدیث عبداللہ بن عباس سے مروی ہے انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے ہاتھ کو ہاتھ میں لے کر فرمایا: اے لڑکے تو حقوق اللہ کی حفاظت کر وہ تیری حفاظت کرے گا!(۱)

---

(۱) یہاں اللہ کی حفاظت کرنے سے مراد اس کو نہاں خانۂ دل میں بسا کر ہمہ وقت اس کے تصور کی حفاظت کرنا اور اس کے علاوہ جملہ تصورات کو مٹانا ہے۔ یعنی اگر بندہ اپنے مالکِ حقیقی کو اپنا مقصود ومطلوب بنالے تو وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ (مترجم)

۲۵

صوفیانہ تشریحات

صوفیائے کے نزدیک مفہوماتِ قرآن وحدیث

مستنبطات کسے کہتے ہیں؟ اس کے جواب میں صوفیہ بیان کرتے ہیں کہ جو کچھ مفہوم اہل فہم اور متحققین قرآن کو سنت سے اخذ کرتے ہیں اسے متنبسطات کہتے ہیں۔ یہ اہل فہم و متحققین امت کے بالغ نظر افراد ہوتے ہیں جو کتاب اللہ اور سنتِ رسول سے ظاہری و باطنی طور پر موافقت رکھتے ہیں اور ان کی اتباع کو کسی وقت بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ وہ قرآن وسنت کے ظاہری و باطنی احکامات پر پوری طرح عمل پیرا ہوتے ہیں۔ اور جب انھیں قرآن وسنت کی اتباع کا یہ کمال حاصل ہوتا ہے تو اللہ کی جانب سے انھیں ایسا علم عطا کیا جاتا ہے جو وہ پہلے نہیں جانتے ۔ یہ علم اشارہ کہلاتا ہے۔ پھر مزید یہ کہ انھیں ان کے درجاتِ عبودیت کے مطابق سربستہ حقائق واسرار سے باخبر کیا جاتا ہے۔

الغرض مذکورہ تمام درجات واحوال سے گذرنے کے بعد یہ اہل دانش وبینش قرآن وسنت سے جو کچھ اخذ کرتے ہیں اسے مستنبطات کہتے ہیں۔

قولِ خداوندی ہے :

”اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا“ (۱)	توکیا وہ قرآن کو سوچتے نہیں یا بعضے دلوں پر ان کے قفل لگے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: جس نے جو کچھ جانا اس پر عمل کیا اس کے بدلے اللہ کی طرف

---

(۱) محمد صلی اللہ علیہ وسلم : ۲۴

جنید بغدادی علیہ الرحمہ کہتے ہیں کہ فقیر صادق کسی شے سے غنائ طلب نہیں کرتا بلکہ ہر شے اس سے غنائ طلب کرتی ہے۔

مرتعش نیشاپوری علیہ الرحمہ کہتے ہیں : فقیر صادق کو مصائب و آلامِ روزگار ستاتے ہیں مگر اسے ان کی طرف متوجہ ہونے کی فرصت ہی نہیں ہوتی۔

الغرض صوفیہ کرام کے مفہومات میں ان کے احوال و مراتب کے لحاظ سے فرق بھی پایا جاتا ہے اور سالکین اپنے اپنے مقام و مرتبے کے مطابق ان سے مستفید ہوتے ہیں۔

○

اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ "(۱)

تو کیا اونٹ کو نہیں دیکھتے کیسا بنایا گیا۔

لیکن جہاں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرمایا تو براہِ راست انہی کے ذکر سے خطاب کو شروع کیا۔

جیسا کہ فرمایا:

"اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ"(۲)

اے محبوب کیا تم نے اپنے رب کو نہ دیکھا کہ کیسا پھیلایا سایہ۔

حبیب و خلیل

قولِ باری تعالیٰ ہے:

وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا"(۳)

اور اللہ نے ابراہیم کو اپنا گہرا دوست بنایا۔

اس آیت کی تفسیر میں صوفیہ کہتے ہیں کہ خلیل، خُلّت سے ماخوذ ہے اور خُلّت کا معنی ہے وہ چیز جو دل کو چھیڑے اور اس میں سوراخ کرے جب کہ محبت کا مطلب ہے ایسی شے جو دل کے وسط میں جگہ کرے اور دل کے سوا دل میں جو کچھ ہو اُسے مٹا دے یہیں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حبیب کو خلیل پر کس قدر فضیلت حاصل ہے۔

خلیل سے یوں خطاب فرمایا:

"اِفْعَلْ مَا تُؤْمَرُ"(۴)

کیجئے جس بات کا آپ کو حکم ہوتا ہے۔

اور حبیب سے خطاب ہوا تو یوں:

"وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى"(۵)

اور بے شک قریب ہے کہ تمہارا رب تمہیں اتنا دے گا کہ تم راضی ہو جاؤ گے۔

---

(۱) الغاشیۃ : ۱۷ ۸۸

(۲) الفرقان : ۴۵ ۲۵

(۳) النساء : ۱۲۵ ۴

(۴) الصّٰفّٰت : ۱۰۲ ۳۷

(۵) الضحیٰ : ۵ ۹۳

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے صبر بالمراقبہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا :

وَ اصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ(۱) اور اے محبوب تم صبر کرو اور تمھارا صبر اللہ ہی کی توفیق سے ہے ۔

یہاں آپ کے لیے صبر کی جزا کا ذکر تک نہیں کیا کیونکہ آپ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ اس قدر خاص ہے کہ آپ کے ساتھ معاوضہ وغیرہ کی بات ہی نہیں فرمائی ۔

○

---

(۱) النحل ، ۱۲۷

۱۶

ہے کہ اگر عیسیٰ علیہ السلام کا یقین بھی میرے یقین کی طرح زیادہ ہوتا تو انھیں بھی ہوا پر چلنے کی قوت عطا کی جاتی۔

میں (شیخ ابو نصر) نے حصری علیہ الرحمہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول: "مجھے اللہ کے ہاں ایک ایسا وقت بھی حاصل ہے جس میں میرے ساتھ سوائے اس کے کوئی شریک نہیں ہوتا" کی یہ وضاحت کرتے ہوئے سنا کہ چاہے یہ صحیح ہو یا غلط کہ آپ نے ہی یہ بات کی۔ پھر بھی حقیقت یہ ہے کہ آپ کے جملہ اوقات میں کیفیت ایسی ہی رہتی تھی کہ ان کے ساتھ سوائے اللہ کے کوئی اور شریک نہ ہوتا۔ ہاں جس وقت انھیں خلق کو سکھانے اور تربیت دینے کا اَمر کیا جاتا تو وہ ایسی حالت میں لوٹ آتے کہ ان کی صفات پر احکام کی عملی کیفیت جاری کر دی جاتی تاکہ لوگ ان سے استفادہ کر سکیں۔ پھر جب ان کی صفات پر انوار باطن کی تجلی ہوتی تو وہ خلق سے جدا ہو کر خالق سے جا ملتے۔ جیسا کہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں ایک رات کو اچانک بیدار ہوئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بستر اطہر میں موجود نہیں۔ میں انھیں ڈھونڈنے اٹھ کھڑی ہوئی تو میرے ہاتھ ان کے پاؤں پر جا پڑے، جب کہ وہ سجدے میں محو تھے۔ میں نے اس وقت آپ کو یہ دعا پڑھتے سنا: "اللھم اعوذ برضاك عن سخطك الخ" یہی وہ وقت ہوتا تھا جب کہ آپ خلق سے کٹ کر اپنے رب کے قریب ہوتے اور ایسے میں آپ کے رب کے سوا کوئی اور نہ ہوتا تھا۔

احادیث نبوی اور صوفیہ کے اخذ کردہ مفہومات

ابو الحسن احمد بن محمد بن سالم سے بصرہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے بارے میں سوال کیا گیا: "سب سے پاکیزہ اور اچھی خوراک وہ ہے جو بندہ اپنے ہاتھوں سے کما لائے۔" سائل نے پوچھا کہ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہم کمانے کے غلام بن کر رہ جائیں گے، آپ نے جواب دیا: "کمانا سنت رسول ہے۔ اور توکل رسول اللہ کا حال ہے۔ آپ نے امت کے لیے کسب کو اس لیے سنت ٹھہرایا کہ وہ ان کی کمزوری سے واقف تھے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ توکل جو کہ آپ کا حال ہے اگر اس سے لوگ عاجز ہوں اور وہ اس مقام و مرتبے سے گر جائیں جو آپ کو توکل میں حاصل تھا تو انھیں کسب تھام لے جو کہ آپ کی سنت ہے۔ اگر یہ بھی نہ ہوتی تو وہ ہلاکت کا شکار ہو جاتے۔

مذکورہ بالا حدیث کی ایک شرح یہ بھی کی گئی ہے کہ اگر بندہ اپنے رب کے حضور دعا کے لیے

۲۹ صحابۂ رسول رضوان اللہ علیہم اجمعین

ذکر و محاسنِ صحابہ

ارشاد خداوندی ہے :

"وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ	اور سب میں اگلے پہلے مہاجر و انصار اور
وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ	جو بھلائی کے ساتھ ان کے پیرو ہوئے
بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ	اللہ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی۔
رَضُوْا عَنْهُ "(۱)	

آیت کے ظاہر سے تو سابقون کا اطلاق تمام صحابہ کرام پر ہوتا ہے اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اللہ ان سے راضی ہوا اور یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ وہ اللہ سے راضی ہیں مگر ایک اور آیت سے اس بات کا ثبوت بھی ملتا ہے کہ یہی سابقین دراصل مقربین ہیں جیسا کہ فرمایا :

"وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ اُولٰٓئِكَ	اور جو سبقت لے گئے وہ سبقت ہی لے
الْمُقَرَّبُوْنَ "(۲)	گئے کہ یہی بارگاہ میں مقرب ہیں۔

مقربین کی خصوصیات اور وجہ تخصیص ہم صفحات گذشتہ میں بیان کر آئے ہیں۔

اور فرمایا :

"وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ "(۳)	اور اللہ کی رضا سب سے بڑی ہے۔

ذوالنون مصری علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ اکبر سے مراد اقدم یعنی بہت قدیم ہے گویا اللہ تعالےٰ نے رضی اللہ عنہم اپنے قدیم علم کی بنا پر کہا۔ اس طرح مفہوم یہ ہوا کہ اللہ نے چاہا کہ وہ اس سے رضا طلب کریں اور پھر انہیں راضی کر دیا حتیٰ کہ وہ راضی ہو گئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میرے صحابی ستارے ہیں ان میں سے تم نے جس کی پیروی کی تم نے ہدایت پالی"۔ اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں نجوم (بڑے ستاروں) کی قسم کھائی ہے جن سے ان کی زیادہ روشنی کی وجہ سے بحر و بر میں رہنمائی حاصل کی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ اللہ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو نجوم سے تشبیہ دی ہے نہ کہ کواکب سے کیونکہ کواکب چھوٹے ستارے ہوتے ہیں جن سے رہنمائی

---

(۱) التوبۃ : ۱۰۰ (۲) الواقعہ : ۱۰-۱۱ (۳) التوبۃ : ۷۲

۹ ۶ ۹

بھی نہیں کھولوں گا جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لگایا ہو۔

اور تیسری مرتبہ اس وقت جب آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: اے عائشہ! میں نے تجھے ایک تحفہ دیا اور وہ ہے تیرے دو بھائی اور دو بہنیں۔ جب کہ عائشہ صدیقہ کو صرف یہی معلوم تھا کہ ان کے دو بھائی اور ایک بہن تھی۔ واقعہ یہ تھا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ایک لونڈی امید سے تھیں جب آپ نے فرمایا: کہ میرے وجدان میں یہ بات ڈال دی گئی ہے کہ وہ بچی کو جنم دے گی اور اس نے بچی ہی جنی۔ اور یہ آپ کے فراست والہام جیسی خوبیوں سے مزین ہونے کی ایک بہت بڑی مثال تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مومن کی فراست سے بچو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔"

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عظمت کردار اور شخصیت کی بزرگی سے متعلق اور بھی بے شمار واقعات و روایاتِ صحیحہ موجود ہیں مگر طوالت سے بچنے کی خاطر اختصار ہی کو کافی سمجھا گیا۔

بکر بن عبد اللہ الحزنی کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فضیلت و فوقیت باقی صحابہ پر کثرتِ صوم و صلوٰۃ کی وجہ سے نہیں بلکہ وجۂ فضیلت وہ ایک چیز تھی جو آپ کے دل میں موجود تھی۔ بعض صوفیہ کا خیال ہے کہ وہ چیز، اللہ سے محبت اور اخلاص تھا۔

کہا جاتا ہے کہ جب نماز کا وقت آن پہنچتا تو ابوبکر صدیق فرمایا کرتے: "اے آدم علیہ السلام کی اولاد! اٹھو اور اس آگ کو بجھا ڈالو جسے تم نے جلا رکھا ہے۔"

ایک روایت ہے کہ اگر کبھی آپ نے کوئی چیز کھائی اور بعد میں شبہ پڑ گیا تو اسی وقت اُسے قے کر کے اگل دیتے۔ اور فرماتے: "خدا کی قسم! اگر اس مشتبہ کھائی ہوئی چیز کے ساتھ میری روح بھی نکل جائے تو میں اسے خارج کرنے میں تأمل نہ کروں گا۔ کیونکہ میں نے آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان وحی ترجمان سے یہ سنا ہے کہ جس جسم کو حرام کی غذا ملی ہو وہ آگ کی بہت زیادہ مستحق ہو گی۔" اور آپ فرمایا کرتے: چاہتا ہوں کہ میں سبزہ ہوتا اور مجھے چرندے کھاتے اور خوفِ عذاب و دہشت یوم الحساب کا سوچ کر خیال کرتا ہوں کہ مجھے تو پیدا ہی نہ کیا جاتا۔"

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: قرآن کریم کی تین آیات

والے تھے، حقوق کے اعتبار سے اپنوں اور بیگانوں کے ساتھ یکساں سلوک فرماتے طاعات کو اختیار کرنے میں شدت برتتے ۔ اور ممنوعہ چیزوں سے اجتناب میں سختی سے کاربند تھے ۔ آپ کی اس قسم کی باتیں بہت طویل ہیں جن سے چند ہم نے بیان کی ہیں ۔

یہ جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا جاتا ہے کہ انھوں نے ایک جماعت کو مسجد میں بیٹھا دیکھا تو انہیں کام کر کے کمانے کا حکم دیا ۔ اور جس کے بارے میں انھوں نے حضرت سلمان کو بھی لکھا، تو یہ اس لیے کہ آپ کو اس جماعت کے مسجد میں بیٹھنے میں کوئی کمزوری یا لوگوں سے طمع رکھنے جیسی برائی نظر آئی ہو گی یا کوئی اور کمزوری ۔ اسی بنا پر آپ نے انھیں ہاتھ سے کمانے کا حکم دیا (ورنہ مسجد میں صرف للہ فی اللہ بیٹھا جائے اور کوئی کمزوری قلب و نظر میں نہ ہو تو اس میں کوئی قباحت نہیں) کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عمر و ابوبکر رضی اللہ عنہما نے اصحاب صفہ کو دیکھا ہی تھا جب کہ ان کی تعداد تین سو دس یا اس سے زیادہ تھی مگر رسول اللہ، حضرت عمر اور حضرت ابوبکر نے اسے برا نہیں منایا اور نہ ہی اصحابِ صفہ کو مسجد سے نکل کر کسبِ معاش کا حکم دیا ۔

ایک روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے غزوہ احد کے روز اپنے بھائی زید بن الخطاب سے فرمایا: اگر تو پسند کرے تو میں اپنی زرہ آتار کر تجھے دے دیتا ہوں ۔ جواباً زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "جیسے آپ شہید ہونا چاہتے ہیں ویسے ہی مجھے بھی شہادت عزیز ہے ۔" مذکورہ روایت میں حضرت عمر کا بغیر زرہ کے میدان جہاد میں جانے کی خواہش سے ہمیں حقیقتِ توکل کے بارے میں ایک بہت بڑا اشارہ ملتا ہے ۔

روایت ہے حضرت عمر نے فرمایا: میں نے چار چیزوں میں عبادت کو موجود پایا ہے:

پہلی: اللہ کے فرائض کی ادائیگی ۔

دوسری: اللہ کی منع کی ہوئی چیزوں سے اجتناب ۔

تیسری: فقط اللہ سے ثواب پانے کی خاطر امر بالمعروف کرنا ۔

چوتھی: اللہ کے غضب سے بچنے کے لیے برائیوں سے لوگوں کو روکنا۔"

۳۲

امیر المؤمنین حضرت علی ابنِ ابی طالب رضی اللہ عنہ

احمد بن علی وجیہی نے ابو علی رودباری سے اور انھوں نے جنید بغدادی کو یہ کہتے سنا: اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ جنگوں میں شریک نہ ہوتے تو ہمیں اپنے علم سے بہت مستفیض فرماتے آپ کو اللہ تعالیٰ نے علم لدنی عطا فرمایا تھا۔ اور یہ علم لدنی ایسا علم ہے جس سے حضرت خضر علیہ السلام کو بھی نوازا گیا تھا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا۔"(۱) اور اسے اپنا علم لدنی عطا کیا۔

آپ نے موسیٰ و خضر علیہما الصلوٰۃ والسلام کا قصہ ضرور سنا ہوگا کہ جب خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا:

"اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا"(۲) آپ میرے ساتھ ہرگز نہ ٹھہر سکیں گے۔

یہاں پر بعض لوگوں کو یہ مغالطہ ہوا کہ ولایت کو نبوت پر فضیلت دی گئی۔ انشاء اللہ آئندہ صفحات میں ہم اس طرح کا خیال رکھنے والوں کی تردید کریں گے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ خصوصیت حاصل تھی کہ آپ کو اللہ نے گہرے مطالب و معانی لطیف اشارات، علم ایمان اور معرفتِ توحید سے متعلق خوبصورت و دلنشین عبارات و اقوال سے نوازا۔ اس کے ساتھ آپ کے اخلاق اور عادات بھی ارفع تھیں۔ جملہ صوفیہ کرام آپ کی مذکورہ خصوصیات کو اپنے لیے ایک نمونہ سمجھتے رہے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے متعلق روایات و اخبار کافی ہیں

---

(۱) الکہف: ۶۵

(۲) الکہف: ۶۷

کے لیے نہ ہو سستی و کمزوری ہے۔ اللہ تعالے اس بندے پر رحم کرے جس نے اپنی قوتِ گویائی کو ذکرِ خداوندی، خاموشی کو فکر، نظر کو عبرت اور حرکت کو اللہ کی بندگی کے لیے وقف کر دیا ہو۔ اور لوگ اس کی زبان اور ہاتھوں سے محفوظ ہوں۔

○

روز باہر ہی رہے ۔

روایت ہے کہ سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے ایک بار ابو دردا، رضی اللہ عنہ سے اس حال میں ملاقات کی کہ وہ عراق سے شام کی طرف پیدل جا رہے تھے انھوں نے موٹے کپڑے کا جبّہ پہنا ہوا تھا اور چہرے کا رنگ متغیر تھا ان کی یہ حالت دیکھ کر کسی نے کہا کہ آپ نے خود کو ذلیل کر دیا ہے ۔ حضرت سلمان نے فرمایا: آخرت کا سنور جانا ہی اصل بھلائی ہے اب تو میں غلام ہوں اور اسی لیے غلاموں جیسا لباس پہنتا ہوں جب مجھے آزاد کر دیا جائے گا تو پھر خوبصورت لباس پہنوں گا ۔

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں دورِ جاہلیت میں تاجر تھا اسلام قبول کیا تو چاہا کہ تجارت اور عبادت کو یکجا کر لوں مگر ایسا نہ ہو سکا اور بالآخر میں نے عبادت کو تجارت پر ترجیح دی ۔

حضرت ابو درداؑ رضی اللہ عنہ کی والدۂ محترمہ سے ان کی افضل عبادت کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا: تفکر اور توکل ۔

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میرا حق پر قائم رہنا فقط اللہ کے لیے ہے ۔ اور اللہ سے میرے اسی تعلق نے میرے لیے کوئی دوست نہ چھوڑا ۔ روزِ حساب کے خوف سے میرے جسم پر گوشت باقی نہ رہا ۔ اور اللہ کی جانب سے ملنے والے ثواب پر پختہ یقین نے میرے گھر میں کچھ نہ رہنے دیا ۔ مجھے اس ایک دن کا غم کھائے جا رہا ہے جو ابھی آیا بھی نہیں ۔ کسی نے سبب پوچھا تو فرمایا: میری امید میری اجل سے بھی آگے نکل گئی میں چاہتا ہوں کہ اللہ نے مجھے درخت پیدا کیا ہوتا جسے کاٹ دیا جاتا ۔

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ کسی دعوتِ ولیمہ میں تشریف لے گئے مگر وہاں آپ نے کوئی ایسی بات سنی کہ یہ کہتے ہوئے، وہاں سے لوٹ آئے کہ جس نے لوگوں کے گناہوں میں اضافہ کیا وہ بھی انہی میں سے ہے اور جو ان کے اچھے عمل سے خوش ہوا وہ ان کے نیک کاموں میں شریک ہے ۔

حبیب بن مسلمہ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہم کے پاس ایک ہزار درہم لے کر گئے مگر انھوں نے

کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ابو رواحہ رضی اللہ عنہ اچانک رو پڑے۔ انھیں دیکھ کر ان کی اہلیہ بھی رو پڑیں آپ نے پوچھا رونے کا سبب کیا ہے اہلیہ نے کہا اس لیے کہ آپ رُو رہے ہیں۔ اس پر آپ نے کہا میں تو اس لیے رو رہا ہوں کہ مجھے یہ خبر دی گئی ہے کہ دوزخ میں داخل کیا جاؤں گا اور نکالے جانے کی خبر نہیں دی گئی۔

تمیم داری رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ ساری رات اس طرح گذاری کہ کھڑے رہے اور یہ آیت کریمہ تلاوت کرتے ہوئے روتے رہے:

"کیا جنھوں نے برائیوں کا ارتکاب کیا یہ	"اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا
سمجھتے ہیں کہ ہم انھیں ان جیسا کر دیں گے	السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ
جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے۔	اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ"[1]

عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے چیونٹیوں کو کھلاتے تھے۔

ابو رافع رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا یا رسول اللہ! افضل کون ہے؟ آپ نے فرمایا: پاکیزہ دل اور راست گو پاکیزہ دِل شخص کی وضاحت کے لیے عرض کیا گیا تو مزید فرمایا: پاکیزہ دل سے مراد ایسا متقی اور صاف باطن بندہ جس کے دل میں کدورت و حسد نہ ہو، اور جو دنیا سے نفرت اور آخرت سے محبت کرتا ہو۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ ہمیں اپنے اندر ایسا بندہ سوائے ابو رافع کے اور کوئی نظر نہیں آیا۔

محمد بن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو بھلائی عطا کرنا چاہتا ہے، تو اس کی طبیعت میں تین خوبیاں پیدا فرما دیتا ہے، پہلی یہ کہ اسے دین فہمی عطا کرتا ہے۔ دوسری یہ کہ اسے دنیا سے کنارہ کش فرما دیتا ہے۔ اور تیسری یہ کہ اسے عیوبِ نفس دیکھنے کی صلاحیت سے نواز دیتا ہے۔

زرارہ بن اوحی رضی اللہ عنہ بنو قشیر کی مسجد میں نماز پڑھا رہے تھے آپ نے جب یہ آیت تلاوت کی تو گر کر جان بحق ہو گئے۔

---

[1] الجاثیۃ: ۲۱ ۴۵

٣٥

آدابِ صوفیہ

ارشادِ خداوندی ہے :

یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ	اے ایمان والو! اپنی جانوں اور اپنے
وَاَهْلِیْكُمْ نَارًا الخ(۱)	گھر والوں کو اس آگ سے بچاؤ....

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ مذکورہ بالا آیت سے مراد یہ ہے کہ اپنے نفسوں کو ادب سکھاؤ اور انھیں علم سے آراستہ کرو کہ اس طرح تم انھیں جہنم کی آگ سے محفوظ کر لو گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: کسی والد نے کوئی ایسا بچہ نہیں جنا جو اچھے آداب سے بہتر ہو۔

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی کا ایک اور فرمان ہے: اللہ نے مجھے آدب سکھایا اور بہترین ادب سکھایا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہترین ادب سکھائے جانے میں دوسرے انبیائے علیہم السلام سے اس طرح ممتاز ہیں کہ انھیں ادب سکھایا گیا (یعنی بہترین ادب کا امتیاز آپ ہی کی ذات گرامی کو حاصل ہے۔

محمد بن سیرین سے دریافت کیا گیا کہ کون سے آداب اللہ سے قریب تر اور اس کے حضور

سے لبریز مشک میں جو پانی مترشح ہوا اسی قدر لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کے مرتبے کو جانا اور اس کے علاوہ کچھ بھی انہیں معلوم نہیں۔

اہل تصوف سید الکونین ﷺ کی صفت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ سے وعدہ فرمایا کہ وہ انہیں سب کچھ عطا فرمائے گا جو وہ طلب فرمائیں گے۔ حدیثِ قدسی یوں ہے: اے محمد! (ﷺ) مانگئے آپ کو عطا کیا جائے گا تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ حضور مولائے کل حضرت محمد مصطفی ﷺ مانگیں اور وہ عطا نہ کرے۔

دعائے رسول ﷺ

اے اللہ! میرے اوپر، میرے نیچے، میرے دائیں، میرے بائیں، میرے پیچھے، میرے وراء اور میرے سامنے نور عطا کر۔

اے اللہ! میرے قلب میں، میری آنکھوں میں، میرے کانوں میں، میرے جسم میں، میرے استخوان میں نور پیدا فرما۔

مقام مصطفی ﷺ

صوفیہ کرام کہتے ہیں کہ ان کی دعا قبول ہوئی اور انہوں نے جو مانگا وہ عطا ہوا جس پر خود ان کی حدیث دلالت کر رہی ہے۔ آپ نے فرمایا: خدا کی قسم! میں تمہیں اپنی پیٹھ پیچھے بھی اس طرح دیکھتا ہوں جس طرح تمہیں سامنے سے دیکھتا ہوں۔

ہر فضیلت اور شرف جوامت کے کسی بھی فرد کو عطا ہوا ہو وہ درحقیقت فضیلت و شرف محمدی ہی ہے۔ لہٰذا کسی کو وہ کچھ نہ کہنا چاہیے جسے وہ جانتا نہ ہو۔

اولیاء اللہ پر تنقید اللہ سے روگردانی کی علامت ہے

ایک اجل صوفیہ کا قول ہے: جب قلب اللہ تعالیٰ سے جدا ہونے اور منہ موڑنے کا خوگر ہو جائے تو اس کے نتیجے میں وہ اولیاء اللہ پر اعتراض و تنقید کے فتنے میں پڑ جاتا ہے۔

مدعیان تصوف کی غلطیاں اور ان کی وجوہات

میں نے احمد بن علیؒ سے اور انہوں نے ابوعلی رودباریؒ سے یہ سنا کہ ہم تصوف کے معاملہ میں اس حد تک پہنچ گئے ہیں کہ جیسے تلوار کی دھار پر ہوں اور ادھر کو جھکیں تو بھی جہنم اور ادھر کو جھکیں تو جہنم یعنی ہم جسے نکتے پر پہنچے ہوئے ہیں اگر اس میں ذرہ بھر بھی غلطی سرزد ہو تو اہل جہنم میں سے ہو جائیں کیونکہ تصوف اور اس کے علم میں غلطی کرنے کے علاوہ باقی ہر شے میں غلطی کرنا زیادہ آسان ہے۔ اس لیے کہ تصوف مقاماتِ احوال، ارادات، مراتب اور اشارات پر مبنی ہے جس نے ان میں حقیقت سے ہٹ کر غلطی کی تو اس نے اللہ کی مخالفت پر کمر باندھی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس نے اللہ کی دشمنی مول لی۔ اب یہ اس کی مرضی ہے کہ اپنی خطا کی معافی مانگ لے یا اس پر ڈٹا رہے۔

جس شخص نے بتکلف اہل تصوف کے طریقوں کو اپنانے کا ارادہ کیا یا یہ اشارہ کیا کہ وہ تصوف سے متعلق کافی معلومات رکھتا ہے یا اس نے یہ خیال کیا کہ وہ صوفیہ کے بعض طریقوں پر عمل پیرا ہے اور صوفیہ کے تین اصولوں پر کاربند نہ رہا تو وہ دھوکے میں ہے چاہے وہ ہوا پر چلے، دانائی کی باتیں کرے یا خواص وعوام میں اسے قبولِ عام بھی کیوں نہ حاصل ہو۔

صوفیہ کے تین اصول

وہ تین اصول یہ ہیں:

ا۔ ہر صغیرہ و کبیرہ گناہ سے اجتناب

۲۔ ہر مشکل اور آسان فرض کی ادائیگی

۳۔ دنیا کو اہل دنیا کے لیے چھوڑ دینا چاہیے تھوری ہو یا زیادہ۔ مگر اس قدر اختیار کرنا کہ جتنی مومن کے لیے ضروری ہو۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: چار چیزیں ایسی ہیں جو دنیا میں ہیں مگر دنیا میں سے نہیں:

ا۔ روتی کا وہ ٹکڑا جس سے تو اپنی بھوک کو مٹائے۔

۲۔ کپڑا جس سے تو اپنی شرمگاہ کو ڈھانپے۔

۳۔ گھر جس میں تو رہے۔

۴۔ نیک سیرت بیوی جس سے تو سکون حاصل کرے۔

مذکورہ چیزوں کے علاوہ وہ سب کچھ جن کا تعلق جمع، منع، دنیوی چیزیں روکے رکھنے زیادہ کی چاہ اور فخر و گھمنڈ سے ہے وہ ایک حجاب ہے جو بندے کو خدا سے منقطع کر دیتا ہے۔ ہر وہ شخص جس نے خاصانِ خدا کے احوال کا دعویٰ کیا یا اس کو یہ خیال ہوا کہ وہ اہل صفا کے مقامات سے گزرا مگر سطور گزشتہ میں بیان کردہ تین اصولوں پر اپنی بنیاد استوار نہ کی تو وہ اپنے تمام دعاوی میں سچا ہونے کی نسبت جھوٹا ہونے کی طرف زیادہ قریب ہوگا، اقرار کرنے والا عالم اور دعویٰ کرنے والا جاہل ہوتا ہے۔

تصوف میں غلطی کرنے والوں کے طبقات اور ان کی غلطیوں کی نوعیت

پھر میں نے ان طبقوں کی طرف نظر کی جنہوں نے تصوف میں غلطیاں کیں۔ ان لوگوں کے تین طبقے ہیں۔ ایک طبقہ وہ ہے جس نے اصولِ شریعت پر عمل کرنے میں کمی، صدق واخلاص میں کمزوری اور قلت علم کی وجہ سے غلطیاں کیں۔ جیسا کہ کسی شیخ نے کہا: انہیں وصل سے اس لیے محروم کیا گیا کہ انہوں نے اصول کو ضائع کیا۔ دوسرا طبقہ وہ جس نے آداب، اخلاق، مقامات، احوال، افعال اور اقوال جیسی فروع میں غلطی کی جس کا سبب اصول کے بارے میں قلتِ معلومات، حظ نفسانی اور طبعی مزاج کی اتباع ہے اور یہ سب کچھ اس لیے انہوں نے کسی ایسے شخص کی قربت نہیں حاصل کی جو انہیں ریاضت کراتا تلخیوں کے گھونٹ پلاتا اور انہیں اس راستے پر ڈال دیتا جو ان کے مطلوب کو جاتا ہے۔ ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو تاریک گھر میں چراغ کے بغیر داخل ہوتا ہے اور سنوارنے کے بجائے زیادہ بگاڑ دیتا ہے، جب انہوں نے یہ سمجھا کہ اب جوہر نایاب ان کے ہاتھ لگ گیا تو حقیقت یہ تھی کہ سوائے ایک کم قیمت کنکری کے انہیں کچھ ہاتھ نہ آیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اہل بصیرت کی اتباع نہیں کی جو اشباہ، اشکال، اضداد اور اجناس کے درمیان تمیز کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان سے خطا سرزد ہوگئی اور لایعنی ومہمل باتوں میں کثرت کرنے لگے۔ حتیٰ کہ وہ حیران و پریشان ہوکر شکست خورہ، مفتون، زیادتی کرنے والے، غم خورہ وہم گمان کے دھوکے میں گرفتار، جنونی، خودسر، غموں سے چور، غلط دعویٰ کرنے والے اور فقط آرزو کرنے والے ہوگئے۔ پاک ہے وہ ذات والا صفات جس نے انہیں یہ کچھ دیا اور وہی ان کی بیماری اور علاج کو جانتا ہے۔

تیسرا طبقہ وہ ہے جنہوں نے غلطی کی تو اس میں کوئی بڑی علت یا کجی نہ تھی بلکہ صرف لغزش تھی جو جاتی رہی تو وہ مکارم اخلاق، اور بلند معاملات پر فائز ہوگئے، اپنی پراگندگی کو سمیٹا، عناد کو ترک کیا، حق کا اعلان کیا، اپنی عجز وانکساری کا اقرار کیا، اور اس طرح وہ اچھے احوال، روشن افعال، اور بلند درجات کی طرف لوٹ آئے اور ان کی لغزش نے ان کے مراتب کو کم نہ کیا اور ان پر کسی شدید غلطی نے وقت کو تاریک نہ کیا اور ان کی پاکیزگی وصفا مکدر نہ ہوئی۔

مختصراً یہ کہ تینوں طبقات، ارادت، مقاصد اور نیتوں کے تفاوت کے لحاظ سے مختلف احوال رکھتے ہیں۔

کسی نے کہا ہے۔ **ترجمہ شعر:**

”جس نے خود کو ان اوصاف سے آراستہ کیا جو اس میں موجود نہ تھے تو اس کے غلط دعویٰ کی قطعی کو
اس کی زبان نے کھول دیا۔“

شاعر نے حضور اکرم ﷺ کی اس حدیث کو پیش نظر رکھ کر یہ شعر کہا تھا آپ کا ارشاد ہے: ایمان، ظاہری طور پر خود کو اچھا ظاہر کرنے اور آرزو کرنے کا نام نہیں بلکہ ایمان وہ ہے جو دل میں سما جائے اور اعمال اس کی تصدیق کریں۔ جس نے اصول میں غلطی کا ارتکاب کیا وہ نہ تو گمراہی سے بچ سکتا ہے اور نہ ہی اس کی بیماری کا علاج ہو سکتا ہے مگر اس صورت میں کہ اللہ چاہے تو ممکن ہے اور جس نے فروع میں غلطی کی تو یہ کوئی بڑی آفت نہیں اگرچہ صحت سے بعید ہے۔

فروعات میں غلطی کرنے والے

فقر وغنا میں غلطی کرنے والے طائفے

صوفیہ کے ایک گروہ نے یہ کہا کہ غنا کو فقر پر فضیلت حاصل ہے۔ اس سے ان کا اشارہ غنا باللہ کی طرف تھا۔ نہ دنیوی مال واسباب جیسی حقیر چیزوں کی طرف مگر بعد میں ایک طائفہ نے اس میں ٹھوکر کھائی اور لگے آیات وروایات سے یہ ثابت کرنے کہ دنیوی مال واسباب کا غناء ہی ایک بہترین حال اور طالبین آخرت کے مقامات میں سے ایک مقام ہے۔ اس طائفے نے اپنی سی کوشش کی اور غلطی کا مرتکب ہوا کیونکہ جن صوفیہ کرام نے فقر وغناء پر گفتگو کی اور غنا کو اللہ کی جانب جانے والے کے احوال میں سے قرار دیا تو اس سے ان کی مراد اللہ کے ساتھ غنا اختیار کرنا تھا نہ کہ دنیا کے ساز وسامان کا غنا جس کی قدر و قیمت اللہ کی نظر میں مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں۔

صوفیہ کی ایک جماعت نے فقر، افتقار، صبر، شکر، رضا، تفویض، سکون اور کچھ نہ رکھنے پر اطمینان کے حقائق پر گفتگو کی جب کہ ایک اور گروہ گمراہی میں پڑ گیا اور خیال کرنے لگا کہ یہ فقیر محتاج کہ جس کے پاس صبر و رضا نہیں اسے اس کے فقر پر کوئی ثواب اور فضیلت حاصل نہیں ہوگی جب کہ وہ فقیر جو حالت اضطراری میں صبر ورضاء سے خالی ہے وہ غنی بالدنیا سے افضل ہے۔

نفس کو بنیادی طور پر محتاج پیدا کیا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ قوت لایموت اور مہمانداری کی استطاعت سے محروم ہونے کی صورت میں اطمینان وسکون کا مظاہرہ کرنا صفاتِ بشری سے نہیں۔ نفس فقر کو پسند نہیں کرتا اور نہ ہی طبیعت وخواہش اس سے موافقت کرتی ہے کیونکہ اس کا تعلق حقوق سے ہے جب کہ غناء کو نفس پسند کرتا اور طبیعت وخواہش اس سے موافقت کرتی ہے کیونکہ اس کا تعلق حظوظ سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے غنی کو ایک نیکی کے بدلے دس نیکیاں دینے کا وعدہ فرمایا ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا:

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ [الانعام:١٦٠]

ترجمہ: ''جو ایک نیکی لائے تو اس کے لیے اس جیسی دس ہیں۔''

مگر فقیر کے تو ہر سانس کے بدلے نیکی شمار ہوتی ہے کیونکہ وہ فقر کی تلخی پر صبر کرتا ہے اور صبر کے ثواب کی کوئی معدود و محدود حد نہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ⑩ [الزمر:٩]

ترجمہ: ''صابروں ہی کو ان کا ثواب بھرپور دیا جائے گا بے گنتی۔''

فقر اپنی ذات میں بہتر ہے اور اگر اس میں کوئی علت بھی شامل ہو جائے تو وہ علت ہی اس میں بری ہوگی جیسا کہ قولِ رسول ﷺ ہے: فقر مومن کے لیے گھوڑے کی گال پر بہترین لگام سے بھی زیادہ خوبصورت ہے۔ اس حدیث میں فقر کو کسی اور شے سے مشروط نہیں کیا گیا، جب کہ غنا دنیا (دنیوی امارت) اپنی ذات میں مذموم ہے اگر اس میں اعمالِ صالحہ میں سے کوئی اچھی خصلت شامل ہو جائے تو وہ خصلت ہی اچھی ہے نہ کہ خود غنا جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: غنا کا تعلق کثرت

مال ومتاع سے ہے۔ گویا انہوں نے غنا کو غنا ہی سے مشروط کیا۔

ایک اور طبقے نے یہ کہا فقر وغنا دو ایسے احوال ہیں کہ بندے کو ان کی پیروی کے بجائے ان سے گزر جانا چاہیے اور وہ ان میں ٹھہرا نہ رہے، یہ بات اہل معارف وحقائق کی ہے لیکن احکام حقیقت، آخری مقامات پر پہنچ کر حاصل ہوتے ہیں۔

ایک اور طائفے نے یہ گمان کیا کہ جس نے مذکورہ نظریہ پیش کیا اس نے فقر وغناء کو ایک کر دیا اور کہا کہ باعتبارِ حال دونوں یکساں ہیں تو انہیں یہ جواب دیا جاتا ہے کہ ہم نے آپ کو فقر ناپسند کرنے والا سمجھا حالانکہ ہم نے آپ کو غنا پسند کرنے والا پایا۔ اگر فقر وغنا دونوں ایک جیسے احوال ہیں تو تمہارا یہ موقف دونوں کو یکساں قرار دینے کا اس وقت کہاں ہوتا ہے جب تم ان دونوں احوال کو بیک وقت سینے سے بھی نہیں لگاتے اور بیک وقت دونوں سے نفرت بھی نہیں کرتے۔ اس طرح ان لوگوں کی غلطی عیاں ہو کر سامنے آجاتی ہے۔

ایک اور گروہ نے غلطی کرتے ہوئے کہا کہ فقر کے حال سے مراد صرف محرومی وفقر ہے۔ اور وہ اس معنی میں اس طرح کھو گئے کہ آدابِ فقر تک ان کے ارادے نہیں پہنچے۔ اور ان سے یہ بات پوشیدہ رہی کہ فقر میں فقیر کے لیے فقر کا احساس، حقیقت فقر تک پہنچنے کے لیے درحجاب بن جاتا ہے اور فقیر صادق کے لیے حالِ فقر میں کوئی ایسی خصلت نہیں جو محرومی وفقر سے بہت کم ہو۔ صبر، رضا اور تفویض اپنے مفہوم کے اعتبار سے اس فقر سے کہیں مکمل تر ہیں جو ان خصائل سے متصل نہ ہو۔ اسی طرح فقر کا احساس اور اس سے سکون ومسرت پانا بھی حال کی کجی کا پتہ دیتا ہے اور مقام تک پہنچنے میں حجاب ثابت ہوتا ہے۔

باقی اللہ ہی بہتر جانتا ہے اور اسی کے ہاتھ میں توفیق ہے۔

اسبابِ دنیوی کی کثرت وقلت اور کسبِ معاش

صرف نبی اور صدیق ہی کے لیے مال ومتاع کی کثرت اختیار کرنا درست ہے۔ کیونکہ وہ اشیاء سے دوسروں کی خاطر تعلق رکھے ہوئے ہیں اور مال واسباب سے ان کا ناطہ حقوق کا ہوتا ہے نہ کہ خواہشاتِ نفس کا۔ اس لیے کہ وہ ہیں خرچ کرتے ہیں جہاں اللہ انہیں خرچ کرنے کی اجازت دے اور جہاں خرچ کرنے سے روک دے وہاں خرچ کرنے سے رک جاتے ہیں لہٰذا جس کو اللہ کی اجازت حاصل ہونے کی فضیلت عطا نہ کی گئی ہو اور نہ ہی وہ اہل کمال یا اہل نہایات میں سے ہو تو لامحالہ کثرتِ مال ومتاع اختیار کرنے سے وہ دھوکے اور تاویلات میں پڑ کر غلطی کا مرتکب ہو جاتا ہے۔

جس نے یہ خیال کیا کہ وہ کثرتِ مال سے سکون حاصل نہیں کرتا تو اس سے ہم یہ کہتے ہیں کہ جو شخص اسباب دنیوی سے جو اس کے پاس ہے۔ سکون حاصل نہیں کرتا تو اسے نہ خرچ کرنے سے ہاتھ روکنا چاہیے اور نہ ہی طلب کرنا چاہیے اور قلیل و کثیر اس کی نظر میں یکساں ہو اور جس کے نزدیک قلیل، کثیر پر بھاری نہ ہو اور اس کے ہاں ایک دوسے بڑھ کر نہ ہو، اس کا قلب دنیا کے مالِ مفقود کی طلب اور موجودہ مال ومتاع کو جمع رکھنے سے خالی نہ ہو تو بلاشبہ وہ طالب دنیا اور اپنی خواہشاتِ نفس کی خاطر دنیوی مال کا اکتساب کرنے والا ہے اور جو خود کو اس اصول سے مستثنیٰ سمجھتا ہے تو وہ غلطی پر ہے۔

ایک طبقہ نے تنگ حالی اور کم پسندی کو اختیار کر لیا، گھٹیا لباس اور کم غذا کا خود کو عادی بنا لیا اور یہ گمان کرنے لگے کہ جس نے بھی نفس پر نرمی کی، مباح اشیاء حاصل کیں یا بہتر کھانا کھایا تو یہ اس کے لیے خرابی اور مقام سے گرنے کا باعث ہے اس طبقے کے لوگ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ ان کے حال کے علاوہ ہر حال لغزش ہے جو کہ ان کی غلطی ہے کیونکہ از خود بتکلف بلندی چاہنے، سہولت وامارت اختیار کرنے یا اسی طرح تنگی وکمی سے زندگی گزارنے میں بھی بنیادی طور پر علت وخرابی موجود ہے کیونکہ ایسا کرنے میں تکلف برتا جاتا ہے جو بلاشبہ علت سے خالی نہیں۔ ہاں اس حالت میں علت سے بری ہے کہ اس سے تادیبِ ریاضت نفس مقصود ہو۔ جب وہ ایسا کرنے کی مصیبتوں اور لوگوں کی طرف سے اپنا لحاظ دیکھ لے تو اسے چاہیے کہ پوری کوشش کر کے خود کو اس سے جدا کرے وگرنہ ہلاکت میں پڑ جائے گا اور ابد تک بہتری کی امید نہیں کی جا سکے گی۔

عبادت گزاروں کی ایک جماعت وہ ہے جو کما کر روزی حاصل کرنے کا موقف رکھتے ہیں اور اپنے کسبِ معاش کی طرف مائل ہیں وہ ان لوگوں پر اعتراض کرتے ہیں جو ان کی طرح کماتے نہیں۔ ان کا یہ خیال ہے کہ حال کی صحت کا دارومدار غذا کی صفائی پر ہے۔ اور غذا کی صفائی ان کے نزدیک کسب یعنی خود کما کر حاصل کرنے کے بغیر ممکن نہیں۔ ان لوگوں نے اپنے اس موقف میں غلطی کی کیونکہ کسب میں رخصت وجواز تو صرف اس کے لیے ہے جو حالِ توکل کو اختیار کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کا حال ہے اور ان کو اللہ تعالیٰ نے توکل کرنے اور یہ یقین کرنے پر مامور فرمایا کہ اللہ ہی ان کو ان کا مقررہ رزق عطا فرمائے گا۔ اسی طرح تمام انسان بھی اس پر مامور ہیں کہ وہ اللہ پر توکل رکھیں اور اللہ نے جو وعدہ فرمایا ہے اس پر یقین رکھیں اور رزق نہ ہونے کی صورت میں سکون کا مظاہرہ کریں حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ ان کے مقررہ رزق ان کو پہنچا دے

جس سے اس طرح کا توکل نہ ہو سکے تو رسول اللہ ﷺ نے اس کے لیے چند شرائط کے ساتھ کسب کو مباح قرار دے دیا تا کہ وہ ہلاکت سے بچے رہیں۔ شرائط کسب یہ ہیں کہ کسب کی طرف مائل نہ ہو، یہ نہ سمجھے کے رزق کسب سے ملتا ہے۔ اپنے کسب کو اپنے لیے غنیمت نہ سمجھے بلکہ کمانے سے اس کا ارادہ مسلمانوں کی اعانت ہو۔ کسب معاش سے فرض نماز کے اولین وقت میں ادائیگی سے غافل نہ کرے اور علم شریعت حاصل کرے تا کہ مبادا حرام کھائے۔ اگر کسبِ معاش ان شرائط میں سے کسی ایک سے بھی خالی ہو تو بلا شک و ریب ایسی کمائی آفت و مصیبت سے عبارت ہے۔ اگر اسے یہ معلوم ہو کہ اس کے کچھ ساتھیوں نے کسب نہیں کیا اور وہ محتاج ہیں تو اس کا فرض ہے کہ اپنی روزی میں سے زائد انہیں دے۔ جس نے یہ شرائط پوری کیں تو مجھے اس سے اکتساب میں غلطی کرنے کا خدشہ ہے۔

کچھ لوگ وہ ہیں جو کسب کرنے والوں پر اعتراض کرتے ہیں، اپنے حال پر بھروسہ کئے انتظار کرتے رہتے ہیں کہ کوئی آ کر ان کو غذا مہیا کرے۔ ان کے نزدیک یہ حالت ان کا ''حال'' ہے حالانکہ ان کا یہ عمل سراسر غلطی پر مبنی ہے کیونکہ کسب کرنے سے رخصت صرف اسی کو ہے جس کو قوتِ یقین اور قوتِ صبر حاصل ہوا اور اگر کسی کا یقین کمزور ہو اور اس کی طبیعت اور طمع نفس اس پر غالب ہو تو اس کے لیے یہ حکم ہے کہ وہ طلب کسب کرے اور ترک طلب ایمان کی قوت کے ساتھ مکمل و افضل ترین ہے۔

ارادات میں غفلت، مجاہدات میں غلطی اور آرام و آسائش اختیار کرنا

صوفیہ کے ایک گروہ نے عبادات اور نفس کو مجاہدات و ریاضات سے گزارنے میں غلطی کی اور اس طرح انہوں نے عبادات و ریاضات میں اپنی اساس کو محکم نہ کیا، موقع کے لحاظ سے کوئی عمل نہ کیا، نتیجتاً وہ شکست کھا گئے اور اوندھے منہ گر پڑے یہ اس لیے کہ انہوں نے متقدمین کے مجاہدات کا سنا اور یہ دیکھا کہ کس طرح اللہ نے ان کے ذکر کو پھیلایا، لوگوں میں ان کی کرامات مشہور ہوئیں اور انہوں نے قبول عام حاصل کیا تو ان کے نفسوں کو بھی یہ لالچ ہوا اور انہوں نے بھی تمنا کی کہ متقدمین کی سی شہرت و قبولیت حاصل کریں تو انہوں نے بتکلف ریاضات و مجاہدات شروع کر دیئے اور جب مدت طویل گزر گئی اور وہ اپنی مراد کو نہ پہنچے تو وہ سست پڑ گئے اور جب انہیں کسی داعی علم تصوف نے مجاہدہ و عبادت اور ریاضت نفس کی دعوت دی تو اس بات کو انہوں نے بے وزن جانا۔ اگر حق تعالیٰ انہیں اپنی بارگاہ کی طرف لے جاتا انہیں اپنی طاعت پر مداومت اختیار کرنے کا ارادہ فرماتا اور انہیں اپنے لطف و عنایت سے نوازتا تو ان کی رغبتوں میں اضافہ ہو جاتا، ان کی نیتیں قوی ہو جاتیں اور وہ اپنے عمل پر اپنی نیتوں کو برقرار رکھتے مگر جب انہیں یہ کچھ حاصل نہ ہوا تو ان کے ارادے کمزور ان کی ہمتیں پست ہو گئیں بلکہ انہوں نے یہ خیال کیا کہ یہ سب کچھ وقفہ تھا حالانکہ انہوں نے غلط سوچا کیونکہ وقفہ وہ ہے جس سے مجاہدہ کرنے والوں کے قلب کبھی کبھار خوشی پاتے ہیں اور پھر اپنے حال کی طرف لوٹ آتے ہیں البتہ جس حالت سے یہ لوگ دوچار ہوئے تو وہ سستی کاہلی اور جھوٹی آرزوؤں کے سوا کچھ نہیں۔ میں نے احمد بن علی کرخیؒ سے اور انہوں نے ابوعلی رودباریؒ کو یہ کہتے سنا کہ آغاز انجام جیسا ہے اور انجام آغاز کی مانند تو جس نے کسی چیز کو انجام پر پہنچ کر چھوڑ دیا جب کہ وہ آغاز میں اس سے کام لیتا تھا تو بلاشبہ وہ دھوکے میں پڑ گیا۔

ایک طبقہ وہ ہے جنہوں نے سفر کیا، سیاحت کی، مشائخ سے ملے ان کے ساتھ نشست و برخاست کی اور واپس آ کر اپنے ساتھیوں سے فخر کے ساتھ کہا کہ انہوں نے جو کچھ دیکھا اور وہ جن لوگوں سے ملے وہ ان سے کبھی ملے ہی نہیں اور انہوں نے خود کو ثابت قدم صوفیاء شمار کیا، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے واضح غلطی کی کیونکہ سفر کو سفر اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہ انسان کے اخلاق کو روشن بناتا ہے۔ اور صوفیہ سفر اس لیے اختیار کرتے ہیں کہ انہیں اپنے نفوس کی برائیاں نظر آئیں تاکہ وہ ان کو دور کرنے کی کوشش کریں اور وہ ان پوشیدہ اسرار کو بھی پا لیں جو وہ گھر بیٹھ کر نہیں جانتے تھے۔ معارف اور مشائخ کی ملاقات کا حصول، ادب، حرمت، رغبت اور ارادت کا تقاضا کرتا ہے۔ اسے شیخ سے ملتے وقت سب کچھ بھلا کر صرف شیخ کی نصیحت اور وعظ ہی قبول کرنا چاہیے۔ وہ شیخ کے حضور حاضر ہونے کے لیے ہی اپنے نفس سے مطالبہ کرے نہ کہ اپنے نفس کے لیے وہ شیخ سے ملے اور نہایت نرمی و ادب کو ملحوظ رکھے، اپنے قلب کی حفاظت کرے، نظر شیخ پر رکھے اور اس بات سے ڈرتا رہے کہ کہیں شیخ سے اس کی ملاقات اور صحبت اس کے اپنے خلاف حجت ہی نہ بن جائے۔

جس شخص نے ہمارے بتائے ہوئے اصولوں پر عمل کئے بغیر سفر کیا اور اپنے تئیں یہ سمجھا کہ وہ مسافر ہے یا اس نے مشائخ سے ملاقات کی ہوئی ہے تو وہ بہت بڑی بھول کا شکار ہے۔

ایک گروہ وہ ہے کہ جس نے احوال و جائیداد کو خرچ کر ڈالا اور یہ سمجھتے رہے کہ خرچ کرنا اور سخاوت کی عادت ڈالنا ہی شاید مراد مقصود ہے حالانکہ ایسا عمل درست نہیں کیونکہ صوفیہ کی مراد خرچ کرنے اور سخاوت و فیاضی سے یہ نہیں کہ شہرت حاصل کی جائے یا اظہار سخاوت کیا جائے بلکہ انہوں نے تو یہ دیکھا کہ مسبب سے تعلق رکھتے ہوئے اسباب سے ناطہ جوڑنا مقام کی خرابی کا باعث اور حقیقت تک رسائی کے درمیان حجاب کا کام دیتا ہے۔ اگر وہ مال و اسبابِ دنیا خرچ کرتے ہیں تو اس لیے کہ وہ اس علت سے نجات پالیں جو اسباب سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ان کے راستے میں حائل ہوگئی۔ لہٰذا خرچ کرنے سے نہ دولت رہے گی اور نہ اس سے تعلق باقی رہے گا۔ اور جس نے فقط سخاوت و فیاضی کی خاطر دولت کو خرچ کیا اور سمجھا کہ وہ طریق صوفیہ پر گامزن ہے تو اس نے بالکل غلط سوچا۔

ایک جماعت نے یہ کھلم کھلا جائز اشیاء کے استعمال میں پڑ کر اپنے اوقات کی کوئی حفاظت نہ کی اور یہ کہنے لگے کہ ہمیں معلوم نہیں کہ کیا چیز ہے ہم نے تو جو کچھ پایا کھالیا اور سو گئے یہی ہمارا ''وقت'' ہے انہوں نے جو کچھ کہا وہ غلط کیونکہ وقت جب ضائع ہو جائے تو پھر پایا نہیں جاسکتا اور نہ ہی وقت صوفیہ کی نظر میں کوئی ایسی کیفیت ہے جس میں آسائش و سہولت ہو بلکہ ''وقت دائمی ذکر، مسلسل اخلاص، شکر، رضا اور صبر سے معمور ہوتا ہے۔ نفس اور خواہشات دشمن ہیں جو بندے پر فتح و غلبہ پانے کی ٹوہ میں رہتے ہیں جب بندہ ایک لمحے کے لیے بھی غافل ہو جائے تو پھر اس کی خیریت کی توقع کی جاسکتی ہے اور نہ اس کی ہلاکت ٹل سکتی ہے۔ اگر کوئی یہ سمجھے کہ وہ ایسے حال پر فائز ہو گیا ہے کہ وہ ان دشمنوں سے محفوظ ہے تو وہ غلطی پر ہے۔

ترکِ طعام، عزلت نشینی اور ترک دنیا

مریدین ومبتدی سالکین نے جب مخالفتِ نفس کے علم کو سنا تو انہوں نے یہ خیال کیا کہ جب نفس ترک طعام کے ذریعے عاجز ہو جاتا ہے تو اس کے شر، ظلم اور موانع سے بندہ محفوظ رہ سکتا ہے۔ اور نتیجتاً انہوں نے کھانے پینے کی عادت کو ترک کر دیا اور ترک طعام کے آداب کو ملحوظ نہ رکھا اور نہ ہی اساتذہ سے ان آداب کے بارے میں رہنمائی حاصل کی اور کئی کئی دن اور راتیں کھانا پینا چھوڑے رکھا۔ اور یہ سمجھتے رہے کہ یہ 'حال' ہے۔ ان کا یہ عمل غلط ہے کیونکہ مرید کے لیے مرشد وشیخ کا ہونا ضروری ہے جو اسے ہر وہ تعلیم دے جس کی اسے ضرورت ہے تاکہ مبادا اس کے ارادے سے کوئی ایسی مصیبت اور فتنہ پیدا ہو کہ اسے تلف کرنے کی اس میں طاقت ہی نہ ہو اور وہ اس فساد سے بچ نہ سکے۔ اس طرح وہ نفس کے شر سے محفوظ نہیں رہ سکتا اور نہ ہی وہ اسے شر ہٹا سکتا ہے جو اس کی جبلت میں شامل ہو گیا۔ یہی نفس برائی کے راستے پر ڈالنے والا ہے جس نے یہ جانا کہ جب نفس کم کھانے اور بھوک سے شکستہ ہو جائے تو اس کا شر اور آفات دور ہو جاتی ہیں حتیٰ کہ بندہ اس سے محفوظ ہو جاتا ہے تو اس نے غلط خیال کیا۔

ابن سالم علیہ الرحمۃ کہتے ہیں کہ صوفیہ جب غذا کو کم کرنا چاہتے تو ہر جمعہ کے روز بلی کے کان کے برابر کھانا کم کر لیتے۔

میں نے ابن سالم علیہ الرحمۃ سے سنا کہ سہل بن عبداللہ اپنے مریدین کو یہ حکم دیا کرتے تھے کہ وہ ہر جمعہ کو ایک بار گوشت کھایا کریں تاکہ وہ اس قدر کمزور نہ ہو جائیں کہ عبادت نہ کر سکیں۔

میں نے ایک جماعتِ صوفیہ کو دیکھا کہ انہوں نے اپنے نفسوں کو قلتِ طعام، خشک گھاس کھانے اور پانی ترک کرنے کا عادی بنایا ہوا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ان سے فرض نماز قضا ہو جاتی کیونکہ وہ وقت کا صحیح انداز نہیں کر پاتے تھے اور متقدمین کے ان آداب سے بے خبر تھے جو انہوں نے اس طرح کا عمل اختیار کرنے میں روا رکھے ہوئے تھے۔

ایک جماعت الگ ہو کر پہاڑوں کی کھوہ میں جا بیٹھی۔ اور ان عزلت نشینوں نے یہ سمجھا کہ وہ لوگوں سے بھاگ رہے ہیں یا پہاڑوں اور جنگلوں میں جا کر اپنے نفسوں کے شر سے چھٹکارا پاتے ہیں یا یہ کہ اللہ تعالیٰ انہیں بھی ترک دین کے ذریعے ان بلند احوال ومقامات پر فائز فرمائے گا جن تک اس نے اپنے اولیاء کو پہنچایا اور اگر وہ لوگوں میں رہیں گے تو اللہ تعالیٰ انہیں ترقی نہیں دے گا۔ حالانکہ ایسا کرنے میں ان سے خطا ہوئی کیونکہ ائمہ مشائخ کرام جن کی طمع کم اور خلوت وتنہائی دائمی تھی اور انہوں نے عزلت اختیار کی تو اس کی طرف انہیں مرشد نے راغب کیا اور حال کی قوت نے ان کی رہنمائی کی جس کے نتیجے میں ان کے قلوب پر ایک ایسی کیفیت طاری ہو گئی جس نے انہیں جان پہچان، وطن اور کھانے پینے سے دور رکھا اور حق نے انہیں اس طرح اپنی جانب کھینچا کہ اپنے سوا ہر شے سے بے نیاز کر دیا۔ الغرض جس کا حال قوی اور واردات کا غلبہ اس پر نہ ہو اور اس کے باوجود وہ تکلف اٹھائے اور اپنے نفس پر ایسا بوجھ ڈالے جس کا وہ متحمل ہی نہ ہو سکے اور نفس پر ظلم کرے تو اس نے اپنے نفس کو ضرور پہنچایا یا نہ وہ کھوئی ہوئی متاع کو حاصل کرے گا اور جو پاس ہو گا وہ بھی کھو بیٹھے گا۔ جس نے بتکلف ایسا کیا پھر یہ سوچا کہ وہ مرتبہ خواص کو پہنچا تو یہ اس کی خام خیالی ہے۔

میں نے نوجوانوں کے ایک گروہ کو دیکھا کہ وہ کم کھاتے، رات بھر جاگتے اور ہر وقت ذکرِ الٰہی میں مشغول رہتے یہاں تک کہ ان میں سے کسی پر غشی طاری ہو جاتی اور اس کے بعد کئی دنوں تک اسے علاج اور سہولت کی ضرورت ہوتی تا کہ وہ اتنی طاقت پا لے کہ فرض نماز تو ادا کر سکے۔

ایک جماعت نے اپنے آلات شہوت کٹوا دیے اور سمجھنے لگے کہ اب جب کہ انہوں نے ایسا کر لیا تو شہوت نفسانی کی آفات سے جان چھوٹ جائے گی۔ ان کا یہ عمل غلط ہے کیونکہ آفات شہوت تو انسان کے اندر سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اگر آلہ کاٹ دیا جائے اور علت باطن میں موجود رہے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں بلکہ الٹا نقصان پہنچتا ہے اور یہ آفت اور بڑھ جاتی ہے۔ لہٰذا جس نے ظاہری آلہ کے کاٹ دینے کو ہی شر نفسانی سے نجات حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھا تو وہ غلطی پر ہے۔

کچھ صوفیہ گھومتے رہے تا آنکہ زادِ راہ لیے بغیر بے آب و گیاہ صحراؤں کی طرف نکل گئے اور یہ سمجھا کہ اس طرح انہوں نے صادقین کے حقیقت توکل کو پا لیا۔ تو انہوں نے بھی یہ غلطی کی کیونکہ جن صوفیہ کا یہ عمل رہا وہ ان کی ابتدائی حالت تھی، دوسرے یہ کہ انہیں آداب کی تربیت حاصل تھی اور انہوں نے اس سے قبل اپنے نفوس کو مجاہدات پر راضی کر لیا تھا وہ اپنے احوال پر ثابت قدم تھے وہ نہ تو قلت کی پرواہ کرتے تھے اور نہ تنہائی سے گھبراتے تھے۔ انہوں نے اس راہ میں کتنوں کو مرتے دیکھا اور کتنی تلخیاں انہوں نے چکھیں حتیٰ کہ ان کے احوال، ویرانے، آبادی، میدان، پہاڑ، جماعت، تنہائی، عزت، ذلت، بھوک، سیری، زندگی اور موت میں یکساں ہو گئے۔

بعض لوگوں نے اُون کا لباس پہننے کا تکلف کیا، پیوند لگی قمیضیں پہنیں، چھاگل اٹھائے رنگے ہوئے کپڑے پہنے، اشارات سیکھے اور یہ سمجھتے رہے کہ جو ایسا کرے وہ بھی صوفیہ میں سے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے یہ سارے کام عبث کیے کیونکہ لباس، آرائش اور مشابہت کا تکلف کر کے کسی کو سوائے حسرت، ندامت، عتاب، ملامت، شرم اور قیامت کو جہنم کے اور کچھ نہیں ملے گا۔ اگر کوئی یہ خیال کرے کہ تبلیس و تشبہ کر کے وہ اہل حقائق کے احوال کو پا لے گا تو یہ اس کی خطا ہے۔

ایک گروہ نے صوفیہ کے علوم کو جمع کیا، ان کے اشارات کو جان لیا، ان کے واقعات یاد کر لیے، بولنے میں فصیح الفاظ اور فصیح عبارات کا تکلف کرنے لگے، اور یہ سمجھا کہ ایسا کر کے وہ صوفیہ میں شمار ہوں گے اور ان کے احوال بلند کو حاصل کر لیں گے، تو یہ ان کی غلط سوچ کا نتیجہ ہے۔

ایک جماعت نے پہلے روزی جمع کر لی، جب ان کے نفوس ان کے پاس موجود مال و دولت سے مطمئن ہو گئے تو وہ اپنے معمولات یعنی نماز، روزہ، قیام اللیل، ورع، کھردرا لباس پہننے، رونے اور خشیت کی طرف لوٹے اور یہ سمجھے کہ یہی وہ مطلوبہ حال ہے جس کے بعد اور کوئی حال ہی نہیں۔ ان کا یہ خیال بھی سراسر غلط ہے۔

میں نہیں جانتا کہ کسی علم تصوف کے جاننے والے شیخ نے ابتداء میں پہلے کی تمام معلومات سے خروج نہ کیا ہو۔ اور اپنے مریدین کو ابتداء سلوک میں جملہ علائق چھوڑنے، اور غیب سے رزق کو متعین سمجھنے کا حکم نہ دیا ہو۔ اگر ان میں سے کوئی کسی سبب معلوم کی طرف لوٹا ہو یا رزق جمع کرنے کا سوچا ہو تو یہ سب کچھ اس نے اپنے لیے نہیں بلکہ اپنے ساتھیوں یا اہل و عیال کی خاطر کیا ہوگا۔

جس نے تصوف کی طرف اشارہ کیا، صوفیہ کے حال کا دعویٰ کیا، خود کو ان میں سے گردانا مگر حقیقت اس کی وہ نہ ہو جو ہم

نے بیان کی تو ایسا شخص غلط راستے پر گامزن ہے۔

تصوف لہو ولعب کا نام نہیں

ایک جماعت کا نظریہ یہ ہے کہ سماع ورقص، دعوتیں برپا کرنا، سہولت و آسائش طلب کرنا، سماع قصائد اور تواجد ورقص کے موقع پر کھانے کے اجتماعات کا تکلف کرنا خوبصورت آواز ون اور دل پسند نغموں کے الحان ترتیب دینے کا حاصل کرنا اور باکمال صوفیہ کے احوال پر مبنی غزلیہ اشعار اختراع کرنا، ہی تصوف کہلاتا ہے۔ بلاشبہ ایسا سوچنے والوں نے غلطی کا ارتکاب کیا کیونکہ ہر قلب جو حب دنیا میں ملوث اور ہر نفس جو باطل کام کرنے اور غفلت کا عادی ہو اس کا سماع و وجد غلطی وعلت سے خالی نہیں اور اس طرح کا وجد وسماع کرنا محض بناوٹ ہے۔

اگر کوئی یہ سمجھے کہ وہ اپنے حیلوں اور تکلفات کے بل بوتے پر بوقت سماع و وجد، محققین صوفیہ میں سے ہو جائے گا تو یہ اس کی غلطی ہے۔

حریت وعبودیت

متقدمین میں سے ایک جماعت نے حریت وعبودیت کے مفہوم پر گفتگو کرتے ہوئے کہا بندے ۱۰ اپنے اور خدا کے درمیان واقع ہونے والے احوال ومقامات میں آزادلوگوں کی طرح نہیں ہونا چاہیے کیونکہ آزاد بندوں ن تو یہ عادت ہوتی ہے کہ جو کام کرتے ہیں اس کا معاوضہ طلب کرتے ہیں اور اس کا انتظار کرتے رہتے مگر غلاموں کی عادت ایسی نہیں ہوتی، کیونکہ غلام اپنے آقا کی طرف سے جس کام پر مامور ہو اس کے لیے نہ کوئی اجرت طلب کرتا ہے اور نہ معاوضے کا انتظار، جب بھی اسے کسی شے کی طمع دامن گیر ہو جائے تو گویا اس نے غلامی کی روش ترک کر دی۔ کیونکہ غلاموں کو الگ ان کا آقا ان کے عمل بدلے کچھ عطا کر دے تو یہ ان کے آقا کی مہربانی ہوگی نہ کہ ان کا استحقاق مگر احرار یعنی آزاد بندوں کا طریق ایسا نہیں ہوتا۔

مشائخ کرام میں سے کسی شیخ نے غلام اور آزاد بندوں کے مقامات سے متعلق ایک کتاب بھی لکھی ہے مگر اس کے باوجود ایک گمراہ فرقے نے یہ سمجھا کہ حریت، عبودیت سے کہیں بلند تر ہے، چونکہ عوام الناس میں یہ بات مشہور ہے کہ آزاد بندے دنیوی احوال میں مرتبہ ودرجہ کے اعتبار سے غلاموں سے اولیٰ واعلیٰ ہوتے ہیں لہٰذا انہوں نے اسی بات کو پیمانہ بنا کر آزاد کو غلام پر ترجیح دی اور اس میں وہ گمراہ ہوئے، اور انہوں نے یہ خیال کیا کہ جب تک بندے اور اللہ کے درمیان تعبد کا تعلق قائم ہے تو وہ غلام کہلائے گا مگر جونہی وہ وصل الٰہی حاصل کرے گا تو وہ آزاد ہو جائے گا اور عبودیت یعنی بندگی اس سے ساقط ہو جائے گی۔

یہ فرقہ کم فہمی کی علمی اور اصول دین کو ضائع کرنے کی وجہ سے گمراہ ہوا۔ اس سے یہ بات پوشیدہ رہی کہ عبد اس وقت تک عبد نہیں جب تک اس کا قلب ہر ماسوائے سے آزاد نہ ہو یہی وہ کیفیت ہے جس پر فائز ہو کر بندہ حقیقت میں اللہ کا بندہ بن جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے عبد سے بڑھ کر کسی اچھے نام سے اپنے بندوں کو نہیں پکارا جیسا کہ ارشاد فرمایا:

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا [الفرقان:٦٤]

ترجمہ: ''اور رحمن کے وہ بندے کہ زمین پر آہستہ چلتے ہیں۔''

اور فرمایا:

نَبِّئْ عِبَادِيْٓ [الحجر:٤٩]

ترجمہ: ''خبر دو میرے بندوں کو۔''

عبد وہ اسم ہے جس سے اس نے اپنے ملائکہ کو موسوم فرمایا:

عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ [الانبياء :٢٦]

ترجمہ: ''بندے ہیں عزت والے۔''

پھر اسی اسم 'عبد' سے اپنے انبیا و رسل کو پکارا:

وَاذْكُرْ عِبٰدَنَآ [ص:٤٥]

ترجمہ: ''اور یاد کرو ہمارے بندوں کو۔''

اور فرمایا:

وَاذْكُرْ عِبْدَنَآ [ص:٤١]

ترجمہ: ''اور یاد کرو ہمارے بندہ کو۔''

اور فرمایا:

نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ [ص:٤٤]

ترجمہ: ''کیا اچھا بندہ۔''

اور اپنے صفی و حبیب ﷺ سے فرمایا:

وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ﴿٩٩﴾ [الحجر:٩٩]

ترجمہ: ''اور مرتے دم تک اپنے رب کی عبادت میں رہو۔''

حضور پرنور ﷺ کے پاؤں مبارک میں نماز پڑھنے سے ورم آ گیا تھا۔ صحابہ کرام نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کے اگلے پچھلے گناہ معاف نہیں فرما دیئے۔ آپ نے فرمایا: کیا میں شکر کرنے والا بندہ نہ بنوں! ①

اختیار مصطفی ﷺ

ایک اور روایت میں ہے کہ مجھے اس بات کا اختیار دیا گیا کہ چاہوں تو فرشتے کے جامے میں نبی بن کر آؤں اور چاہوں تو عبد کے جامے میں نبی بن کر آؤ، جبریلؑ نے میری طرف اشارہ کیا کہ عاجزی اختیار کر لیجئے، اور میں نے کہا: عبد کے جامے میں نبی بن کر آنا چاہتا ہوں۔

اگر خلق اور خدا تعالیٰ کے درمیان عبودیت کے درجہ سے بلند تر کوئی درجہ ہوتا تو رسول اللہ ﷺ ضرور اس پر فائز ہوتے اور اللہ تعالیٰ بھی انہیں وہی درجہ عطا فرماتا۔

---

① اس کی تخریج گزر چکی۔

اخلاص میں اہل عراق کی غلطی

اہل عراق میں سے ایک گمراہ فرقے کے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اخلاص اس وقت تک صحیح نہیں ہوتا جب تک بندہ خلق کی طرف متوجہ ہونے اور اچھے برے عمل میں ان کی موافقت کو ترک نہیں کر دیتا۔ اس فرقے نے یہ بھی سمجھا کہ اہل معرفت کی ایک جماعت نے حقیقتِ اخلاص پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ان کے اخلاص میں صفاء پیدا نہیں ہوسکتا جب تک کہ قلب میں خلق کی طرف توجہ، کائنات کا خیال اور ماسوا اللہ ہر شے کا وجود ختم نہیں ہو جاتا۔ اسی نظریے کو انہوں نے اپنے لیے صحیح سمجھا کہ وہ اس کا دعویٰ کریں، اس کی تقلید کریں اور تکلف کو اپنائیں اس سے قبل کہ وہ راہ سلوک کو طے کریں، آداب تصوف کو سیکھیں، ابتدائی درجات سے آغاز کریں تاکہ وہ بتدریج ایک حال سے دوسرے حال اور ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچ کر نہایات کو حاصل کرلیں مگر ان کا دعویٰ اور غلط توقعات انہیں قلت توجہ، ترک ادب اور تجاوز حدود کی طرف لے گئیں۔ شیطان نے انہیں اپنا اسیر بنالیا اور نفس وخواہشات نے ان پر غلبہ حاصل کرلیا۔ لیکن وہ اپنی طرف سے اسی خیال میں رہے کہ اخلاص میں طریق مخلصین پر کار بند ہیں حالانکہ وہ نقصان وگمراہی میں پڑے رہے اور ان کو اس سے نجات کیونکر ملے کہ ان سے اپنی بدبختی کے سبب یہ حقیقت پوشیدہ رہی کہ درجہ اخلاص پر فائز مخلص بندہ وہ ہے جو مہذب ومؤدب ہو، گناہوں کو ترک کر چکا ہو، طاعات میں خود کو پوری طرح مشغول کر چکا ہو، ارادات پر عمل پیرا ہو اور احوال ومقامات تک پہنچ گیا ہو تاکہ یہ سب کچھ اسے خالص، اخلاص کی منزل پر پہنچا دے۔

جو بندہ اپنی خواہشات کا اسیر، اپنے نفس کا رہیں اور شیطان کا قیدی ہو وہ ایسے اندھیروں میں بھٹک رہا ہے جن کی طرف قرآن کریم نے یوں اشارہ کیا ہے:

ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ؕ اِذَاۤ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ؕ [النور:٤٠]

ترجمہ: ’’اندھیرے ہیں ایک پر ایک جب اپنا ہاتھ نکالے تو سجھائی دینا معلوم نہ دے۔‘‘

ایسا شخص تو مبتدیوں کی منزل سے بھی پیچھے ہے چہ جائے کہ آگے بڑھے۔ اس طرح کے لوگوں کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے نفیس وبیش قیمت موتی کے بارے میں سنا کہ وہ شفاف اور مدور ہوتا ہے، اب اس کے ہاتھ کہیں سے شیشے کا منکا آ گیا جو مدور اور شفاف ہوتا ہے۔ تو اس نے یہ جانا کہ موتی ہے بعد میں اسے کوئی حاجت پیش آ گئی اور وہ اسے جوہری کے پاس لے گیا۔ جوہری نے پرکھ کر کہا یہ شیشہ ہے موتی نہیں اور اس کی کوئی قیمت نہیں مگر اس نے جہالت اور جھوٹی لالچ کو نہ چھوڑا اور یہ نہ کیا کہ اسے پھینک دیتا۔ حالانکہ اس کو خود شیشہ وموتی کے بارے میں کوئی علم نہ تھا۔ الغرض ایسے لوگ ہر روز اپنی گمراہی اور سرکشی کے سبب نقصان اٹھاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو ایسی گمراہی سے اپنی پناہ میں رکھے۔

نبوت وولایت میں غلطی کرنے والے

فضیلت ولایت ونبوت

ایک فرقہ اس گمراہی میں پڑ گیا کہ ولایت کو نبوت پر فضیلت حاصل ہے۔ اور انہوں نے اپنا یہ موقف قرآن مجید میں موجود قصۂ موسیٰ وخضر علیہما السلام میں اپنی رائے کو شامل کر کے حاصل کیا۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَیْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَ عَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا۝
[الکہف:٦٤]

ترجمہ: ''تو ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ پایا جسے ہم نے اپنے پاس سے رحمت دی اور اسے اپنا علم لدنی عطا کیا۔''

پھر موسیٰ علیہ السلام کو کلام ورسالت سے مختص کرتے ہوئے فرمایا:

وَ كَتَبْنَا لَهٗ فِی الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ[الاعراب:١٤٢]

ترجمہ: ''اور ہم نے اس کے لیے تختیوں میں لکھ دی ہر چیز کی نصیحت اور ہر چیز کی تفصیل۔''

خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا:

اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِیْعَ مَعِیَ صَبْرًا۝ [الکہف:٦٧]

ترجمہ: ''آپ ہرگز میرے ساتھ نہ ٹھہر سکیں گے۔''

موسیٰ علیہ السلام نے جواباً فرمایا:

لَا تُؤَاخِذْنِیْ بِمَا نَسِیْتُ وَ لَا تُرْهِقْنِیْ مِنْ اَمْرِیْ عُسْرًا۝[الکہف:٧٣]

ترجمہ: ''مجھ سے میری بھول پر گرفت نہ کرو اور مجھ پر میرے کام میں مشکل نہ ڈالو۔''

قرآن کریم میں موسیٰ وخضر علیہما السلام کے قصے سے اس گمراہ گروہ نے یہ مفہوم اخذ کیا کہ موسیٰ علیہ السلام کی نبوت میں نقص تھا اور خضر علیہ السلام کو ان پر فضیلت حاصل ہے۔ اسی مفہوم نے ان کو یہاں تک پہنچا دیا کہ انہوں نے اولیاء کرام کو انبیاء علیہم السلام پر فضیلت دی اور انہیں اس بات کی طرف توجہ ہی نہ رہی کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے جسے چاہے اور جیسے چاہے کسی بھی چیز سے مختص فرمائے جیسا کہ آدم علیہ السلام کو سجودِ ملائکہ سے، نوح علیہ السلام کو سفینہ سے، صالح علیہ السلام کو ناقہ سے، ابراہیم علیہ السلام کو آگ کی ٹھنڈک اور سلامتی سے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مردے زندہ کرنے سے اور ہمارے نبی کریم ﷺ کو شق القمر اور انگلیوں سے چشمے جاری ہونے سے مختص فرمایا۔

جہاں تک غیر انبیاء کا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ نے بی بی مریم کا ذکر قرآن مجید میں فرمایا:

وَهُزِّیٓ اِلَیۡكِ بِجِذۡعِ النَّخۡلَةِ تُسٰقِطۡ عَلَیۡكِ رُطَبًا جَنِیًّا ﴿۲۵﴾ [مریم:۲۵]

ترجمہ: ''اور کھجور کی جڑ پکڑ کر اپنی طرف ہلا تجھ پر تازی پکی کھجوریں گریں گی۔''

حالانکہ حضرت مریم نبیہ نہ تھیں تاہم انہیں جس چیز سے مخصوص فرمایا گیا اس سے انبیاء علیہم اسلام کو بھی مختص نہ کیا گیا۔ اس سے کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ حضرت مریم رضی اللہ عنہا کو دیگر انبیاء علیہم السلام پر فضیلت دے۔ اسی طرح آصف بن برخیا کے پاس کتاب کا ایسا علم تھا کہ آنکھ جھپکنے سے پہلے تخت بلقیس کو اٹھا لائے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ آصف بن برخیا، حضرت سلیمانؑ سے افضل تھے جنہیں اللہ نے نبوت، فہم اور سلطنت عطا فرمائی تھی، اس کے علاوہ آپ کو اس ہدہد پرندے کے قصے کا بھی علم ہوگا جسے پانی معلوم کرنے کا ایسا علم دیا گیا تھا جو اس کے علاوہ کسی اور پرندے یا جن و انس کو حاصل نہ تھا۔

حضور سید دو عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: تم میں سب سے بڑھ کر علم فرائض جاننے والا زید سب سے بہترین قرأت کرنے والا ابی بن کعب اور سب سے بڑھ کر حلال و حرام کو جاننے والا معاذ بن جبل ہے۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جنت کی بشارت دی جنہیں عشرہ مبشرہ کے نام سے موسم کیا گیا، مگر ان دس صحابہ حضرت زید حضرت ابی بن کعب اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہم شامل نہیں۔

کرامات سید الرسل ﷺ کی اتباع سے ملتی ہیں

اولیاء اللہ رحمہم اللہ کو کرامات سید الکونین محمد مصطفیٰ ﷺ کے حسن اتباع کے نتیجے میں ملتی ہیں تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ تابع کو متبوع پر اور مقتدی کو امام پر فضیلت دی جائے۔

انبیاء علیہم السلام کو جو کچھ عطا ہوتا ہے اس میں سے شمہ بھر اولیاء کرام علیہم الرحمہ کو عطا ہوتا ہے۔

جس نے یہ کہا کہ انبیاء علیہم السلام کو فرشتے کے ذریعے وحی ہوتی ہے جب کہ اولیاء کرام کو براہ راست الہام ہوتا ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہیں پر تو قائل نے غلطی کی کیونکہ انبیاء علیہم السلام کو براہ راست الہام مسلسل ہر وقت ہوتا رہتا ہے جب کہ اولیاء کو کبھی کبھی الہام ہوتا ہے۔ اور اس کے علاوہ انبیاء کو رسالت، نبوت اور جبریلؑ کے ذریعے وحی کی فضیلت حاصل ہوتی ہے جبکہ اولیاء کو ان میں سے کوئی خصوصیت حاصل نہیں ہوتی۔

اگر خضر علیہ السلام پر موسیٰ علیہ السلام کے انوار اور تخصیص کلام سے ایک ذرہ بھی ظاہر ہوتا تو وہ فنا ہو جاتے مگر اللہ نے انہیں ان انوار سے اس لیے حجاب میں رکھا کہ اس سے موسیٰ علیہ السلام کی مزید برآں آراستگی اور انہیں فضیلت عطا کرنا مقصود تھی۔

جہاں تک ولایت و صدیقیت کا تعلق ہے تو وہ خود انوار نبوت سے منور ہوتی ہے۔ صدیقیت و ولایت کو ہرگز نبوت سے ملحق نہیں قرار دیا جا سکتا چہ جائیکہ اسے نبوت پر فضیلت دی جائے۔

اباحت وعدم اباحت میں غلطی کرنے والا فرقہ اور اس کے نظریات کی تردید

ایک فرقۂ گمراہ نے اباحت اور عدمِ اباحت میں اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے یہ کہا کہ دراصل اشیاء مباح ہیں ان سے ممانعت اور احتراز اس وقت لازم ہے جب کوئی ان میں حد سے بڑھ جائے اگر حد سے تجاوز نہ ہو تو اشیاء اپنی اصل حالت یعنی اباحت کی طرف لوٹ جاتی ہیں اور انہوں نے اس آیت سے اپنی تاویل کو منسوب کیا:

فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ﴿۲۷﴾ وَّ عِنَبًا وَّ قَضْبًا ﴿۲۸﴾ وَّ زَيْتُوْنًا وَّ نَخْلًا ﴿۲۹﴾ وَّ حَدَآئِقَ غُلْبًا ﴿۳۰﴾ وَّ فَاكِهَةً وَّ اَبًّا ﴿۳۱﴾ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ﴿۳۲﴾ [عبس: ۲۷، ۳۲]

ترجمہ: ’’تو اس میں اُگایا اناج اور انگور اور چارہ اور زیتون اور کھجور اور گھنے باغیچے اور میوے اور دوب تمہارے فائدے کو اور تمہارے چوپاؤں کے۔‘‘

انہوں نے اس آیت کو غیر مفصل قرار دیا اور اس عمل نے انہیں ان کی جہالت کے سبب اس مقام پر لا کھڑا کیا کہ ان کے نفوس کو یہ لالچ ہوا کہ وہ چیز جسے مسلمانوں کے لیے ممنوع قرار دیا گیا ان کے لیے مباح ہے بشرطیکہ وہ اس میں حد سے تجاوز نہ کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ اصول سے بے خبری، خواہشات کی پیروی اور علم شریعت کے بارے میں قلت معلومات ہی ان کی غلطی اور ایک لطیف سے نکتے کو نہ سمجھنے کا باعث تھی۔

جب انہوں نے مشائخ متقدمین کے مکارم اخلاق، حسن معاشرت اور بھائی چارے کے بارے میں سنا تو انہوں نے بھی خواہشات اور آسائش وسہولت کی خاطر وہی طریق اپنایا، یہاں تک کہ ان میں سے ایک اپنے ساتھی کے گھر جا کر اس کے کھانے میں سے کھا لیتا، اس کی کمائی سے رقم لے لیتا اور اپنے ساتھی کی عدم موجودگی میں اس کے احوال میں اسی طرح تصرف کرتا جس طرح اپنے معاملات میں روا رکھتا۔

اس ضمن میں فتح الموصلی کا واقعہ ہے کہ وہ اپنے کسی ساتھی کے گھر گئے اور اس کی کنیز سے کہا: میرے بھائی کی رقم کی تھیلی مجھے لا دو کنیز تھیلی لے آئی اور انہوں نے اپنی ضرورت کے مطابق رقم اس میں سے لے لی۔ جب ان کا ساتھی گھر لوٹا تو کنیز نے انہیں سب حال کہہ سنایا تب انہوں نے کہا: اگر تو نے سچ کہا ہے تو اللہ کی خاطر تو آزاد ہے۔

حسن بصریؒ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے ایک ساتھی کہ عدم موجودگی میں اس کی تھیلیوں میں سے کھاتے تھے۔ کسی نے اس کے بارے میں سوال کیا تو کہنے لگے: اے لئیم! کیا ہم سے پہلے ایسے لوگ نہ تھے کہ کوئی ان میں سے کسی کے گھر جاتا اس کے طعام اور دراہم میں سے کچھ لے لیتا اور اس سے اس کا ارادہ اپنے بھائی کو خوش کرنا مقصود ہوتا اور یہ سمجھتا کہ ایسی خوشی اس کے لیے سرخ اونٹوں سے بھی زیادہ عزیز ہے۔

صوفیہ کہتے ہیں کہ اہلِ معرفت کے اس گروہ کے مسلک کی بنیاد باہمی رواداری پر ہے نہ کہ باہمی عداوت۔

جیسا کہ ابراہیم بن شیبان علیہ الرحمۃ نے کہا ہم اس شخص کی صحبت اختیار نہیں کرتے جو یہ کہے کہ ہم اعلیٰ ہیں الغرض اس طرح کے واقعات بے شمار ہیں۔

اس فرقۂ گمراہ نے از خود یہ سمجھ لیا کہ صوفیہ کرام اباحت کے اسی غلط مفہوم پر قائم تھے جو انہوں نے اپنے طور پر سمجھ لیا کہ شرعی حدود کو ترک کرنا اور امر و نہی پر کار بند ہونے سے تجاوز کرنا جائز ہے حالانکہ اس طرح یہ لوگ اپنی جہالت میں صحیح راستے سے بہت دور نکل گئے اور اپنے جھوٹے حیلوں اور تاویلوں کے ساتھ ہر ممنوع چیز کی طلب اور اتباع خواہشات سے گریز نہ کیا۔

جو یہ سمجھتا ہے کہ ہر شے فی الحقیقت مباح ہے وہ یہ کیوں نہیں کہا کہ ہر شے اصل میں ممنوع ہے اور امر و نہی کے ذریعے ان کی اباحت، رخصت و سہولت کی خاطر تا کہ بندہ اس بات میں غلطی نہ کر بیٹھے کہ حالال وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ حلال قرار دے اور حرام وہ ہے جسے اللہ حرام قرار دے اور مومنین میں کوئی بھی اس بات کا پابند نہیں بنایا گیا کہ وہ گزری ہوئی شریعتوں یا پہلے کے لوگوں کے اعمال کی اتباع کرے بلکہ ان کے ذمہ یہ فرض ہے کہ وہ انہی احکام کی بجا آوری کریں جن کا انہیں اللہ نے حکم دیا اور ان امور سے باز رہیں جن سے اللہ نے منع فرمایا اور مشتبہ امور سے اجتناب کریں جیسا کہ سید المرسلین ﷺ نے فرمایا: حلال واضح ہے اور حرام بھی واضح، اور ان کے مابین مشتبہ امور ہیں، اور اللہ نے جن امور کو حرام قرار دیا وہ ایک ممنوعہ چراگاہ کی مثل ہیں پس جو اس کے ارگرد چلا گیا تو خدشہ ہے کہ اس کے اندر جا پڑے۔

جن لوگوں نے یہ کہا کہ دراصل اشیاء مباح ہیں ان کا یہ قول اس قول سے کہ دراصل اشیاء ممنوع ہیں، کس طرح اولیٰ نہیں۔ اور جب کوئی کسی زمین کی ملکیت ظاہر کرے تو اس کے لیے ملکیت اسی صورت میں جائز ہو سکتی ہے کہ وہ اپنا دعویٰ دلیل کے ساتھ ثابت کرے۔

اور اس کو نجاست و طہارت کے مسئلہ پر قیاس نہیں کیا جا سکتا کیونکہ فقہا اور صوفیہ کی جماعت کے نزدیک اشیاء دراصل پاکیزہ ہیں جب تک کہ ان کی نجاست پر دلیل نہ لائی جائے۔ نجاست و طہارت اور اباحت و خطر میں فرق یہ ہے کہ نجاست و طہارت عبادات میں شامل ہیں جبکہ اباحت و خطر کا تعلق املاک سے ہے اور جو چیز کسی کی ملکیت میں ہو تو وہ کسی اور کے لیے اس وقت تک مباح نہیں ہو سکتی جب تک وہ دلیل و حجت پیش نہ کر دے۔

فرقۂ حلولیہ کی لغزشیں اور ان کے نظریات

فرقۂ حلولیہ میں سے کسی کو میں خود نہیں جانتا اور ان سے متعلق تمام تر معلومات مجھے دوسرے لوگوں کے ذریعے پہنچی ہیں۔

مجھے معلوم ہوا ہے کہ حلولیہ فرقے کے لوگ یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کچھ اجسام منتخب فرمائے اور ان میں معانی ربوبیت کے ساتھ حلول کیا۔ اور ان سے بشری لوازمات کو زائل فرما دیا۔

اگر واقعتاً کسی نے یہ نظریہ پیش کیا اور اپنے تئیں یہ سمجھا کہ اس نے توحید کو پا لیا تو اس نے غلط سمجھا کیونکہ جب کوئی شے کسی دوسری شے میں حلول کرتی ہے تو وہ اس کی جنس سے ہوتی ہے۔ جب کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس اشیاء سے بالکل جدا ہے اور اشیاء اس سے اپنی صفات کے لحاظ سے جدا ہیں اشیاء میں اس نے جو کچھ ظاہر فرمایا اس کا تعلق اس کے آثار صنعت اور دلیلِ ربوبیت سے ہے کیونکہ مصنوع، صانع پر دلالت کرتا ہے اور مولف اپنے مولف پر۔

اگر یہ سچ ہے کہ حلولیہ نے یہ کہا تو بلاشبہ وہ گمراہ ہوئے کیونکہ انہوں نے قادر کی صفت قدرت اور قدرت قادر و صنعت صانع پر دلالت کرنے والے شواہد کے درمیان کوئی تمیز ہی نہیں کی اور اس میں انہوں نے ٹھوکر کھائی۔

مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ فرقہ حلولیہ میں سے کسی نے کہا: اللہ تعالیٰ انوار کے ذریعے حلول کرتا ہے۔ کسی نے کہا کہ مستحسن شواہد کی طرف ایک انجانی نظر کے ذریعے حلول کرتا ہے۔ کسی نے کہا: مستحسنات وغیر مستحسنات میں حلول کیے ہوئے ہے اور ان میں سے کسی نے کہا: ایک وقت چھوڑ کر دوسرے وقت میں حلول کرتا ہے۔ الغرض ہر وہ شخص جس نے اس قسم کے نظریات واقعتاً پیش کئے ہیں تو وہ گمراہ اور اجماع امت کے تحت کافر ہے کیونکہ جو کچھ اس نے کہا اس سے کفر لازم آتا ہے۔

وہ اجسام جو اللہ نے منتخب فرمائے وہ اس کے اولیاء و اصفیاء کرام کے اجسام ہیں جنہیں اس نے اپنی طاعت و خدمت کے لیے چن لیا انہیں اپنی ہدایت سے آراستہ فرمایا اور خلق پر ان کو فضیلت دی۔ اور اللہ تعالیٰ اسی صفت سے موصوف ہے جیسا کہ اس نے خود اپنی صفت بیان فرمائی ہے کوئی شے اس کی طرح نہیں وہ سننے اور دیکھنے والا ہے۔

حلولیوں نے یہ غلطی بھی کی کہ اوصافِ حق اور اوصافِ خلق میں امتیاز باقی نہیں رکھا۔ اللہ تعالیٰ قلوب میں حلول نہیں فرماتا بلکہ قلوب میں ایمان باللہ، تصدیق، توحید اور معرفتِ الٰہی حلول کرتی ہے اور یہ تمام چیزیں اللہ کی مصنوعات کی صفات ہیں جو ان میں اللہ کی صنعت کے طور پر موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ خود اپنی ذات یا صفات کے ساتھ قلوب میں حلول نہیں فرماتا۔

فناء بشریت کو غلط معانی پہنانے والے

جن لوگوں نے فناء بشریت میں ٹھوکر کھائی اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے مستحقین کی فنائے متعلق گفتگو سنی اور اسے فناء بشریت سمجھ بیٹھے اور وسوسہ میں پڑ گئے۔ ان میں سے کچھ نے تو کھانا پینا بھی چھوڑ دیا کیونکہ ان کے نزدیک بشریت ایک قالب اور ڈھال ہے کمزور ہوا تو بشریت جاتی رہی لہٰذا یہ جائز قرار دیا کہ وہ موصوف بصفاتِ الٰہیہ ہیں۔ اس فرقہ گمراہ سے یہ نہ ہو سکا کہ بشریت اور اخلاقِ بشریت میں فرق کرتے، بشریت، بشر سے زائل نہیں ہوتی جیسا کہ سیاہ رنگت سیاہ آدمی سے اور گوری رنگت گورے آدمی سے زائل نہیں ہوتی جب کہ اخلاق بشریت، انوار حقائق کے غلبہ سے بدلتے رہتے ہیں۔ صفاتِ بشریت، بشریت کا عین نہیں جس نے فنا کی بات کی تو اس سے وجودِ اعمال وطاعات کی فناء کے ذریعے قیام حق کے لیے وجودِ عبد کی بقا مراد ہے۔ اور اسی طرح اس سے مراد علم سے جہالت کی فناء اور ذکر سے غفلت کی فنا ہے۔

وہ چیز جو فناء بشریت کی اصلیت ہے خود فناء بشریت اس چیز کی اصلیت ہے اور بشریت کا بشریت کے ساتھ فناء ہونا صفت بشریت ہے۔ جس نے یہ سمجھا کہ نفس کا زائل ہونا اور بندے سے کبھی کبھی تلوین کی صفت کا جدا ہونا فناء بشریت ہے تو اس نے سرار غلط جانا اور بشریت کی تعریف سے بے خبر رہا۔ کیونکہ تغیر اور تلوین صفت بشریت ہے جب بشریت سے تغیر اور تلوین زائل ہو گئی تو وہ اپنی صفت سے متغیر ہو گئی اور اپنے معنیٰ سے بدل گئی کیونکہ بشریت خود تو نہ متلون ہوتی تھی اور نہ متغیر جب کہ وہ اپنی صفت سے اس وقت متغیر ومتلون کر دی گئی۔

رویت بالقلوب کو غلط سمجھنے والے

ہمیں یہ معلوم ہوا ہے کہ اہل شام کی ایک جماعت یہ دعویٰ کرتی ہے کہ اس دنیا میں انہیں رویت بالقلوب اسی طرح سے حاصل ہے جیسے آخرت میں عیاں طور پر رویت باری تعالیٰ ہو گی۔ میں نے خود ان میں سے کسی کو نہیں دیکھا اور نہ ہی مجھے کسی نے یہ بتایا کہ اس نے ان میں سے کسی شخص کو رویت بالقلوب پر فائز پایا۔ ہاں ابو سعید خرازؒ کا ایک خط میری نظر سے گزرا ہے جس میں انہوں نے اہل شام کو مخاطب کر کے لکھا ہے: مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کے علاقے میں ایک جماعت ہے جو فلاں فلاں دعویٰ کرتی ہے اور انہوں نے آگے چل کر یہ بھی لکھا کہ ان کے زمانے میں بھی ایک قوم ایسی تھی جو اس مسئلہ میں الجھی اور گمراہ ہوئی۔

اہل حق و صداقت نے جب رویت بالقلوب کا ذکر کیا تو اس سے ان کا اشارہ تصدیق مشاہدہ بالایمان اور حقیقت یقین کی طرف تھا جیسا کہ رسول اللہ ﷺ سے رویت ہے کہ آپ نے فرمایا: ''گویا کہ میں اپنے رب کے عرش کو ظاہر دیکھتا ہوں۔'' جیسا کہ اس حدیث میں آگے چل کر بیان کیا گیا ہے: ''بندہ جس کے قلب کو اللہ نے منور فرمایا: اوکما قال۔

جیسا کہ مجھ تک خبر پہنچی ہے کہ وہ بصرہ کے ابو عبداللہ الصبیحیؒ کے مریدین کی ایک جماعت تھی جو رویت بالقلوب کے بارے میں وسوسہ اور گمراہی کا شکار ہوئی۔ میں نے ان لوگوں کی جماعت کو دیکھا کہ انہوں نے بخوشی اپنے نفس کو مجاہدہ، شب بیداری، ترکِ طعام، خلوت نشینی خلق سے علیحدگی اور کثرتِ توکل کی مشقت میں ڈال رکھا تھا کہ شیطان نے انہیں اپنے دام میں پھنسالیا اور خود کو ان کے سامنے ایسے دکھایا کہ ایک تخت پر بیٹھا ہے اور اس سے انوار کی شعائیں پھوٹ رہی ہیں۔ ان میں کچھ نے یہ واقعہ بعض شیوخ کے سامنے بیان کیا جو شیطان کی فریب کاریوں کو جانتے تھے شیوخ نے انہیں شیطان کی فریب کاری کے بارے میں بتایا اور انہیں ہدایت کر کے استعامت کی طرف لوٹا دیا۔

کہتے ہیں کہ سہل بن عبداللہؒ کے ایک شاگرد نے ایک روز ان سے کہا: یا استاد! میں ہر رات اللہ تعالیٰ کو اپنی ان ظاہری آنکھوں سے دیکھتا ہوں۔ سہل بن عبداللہؒ جان گئے کہ یہ دشمن (شیطان) کا دھوکہ ہے۔ انہوں نے کہا: عزیزم! جب تو اسے آج کی رات دیکھے تو اس پر تھوک دینا۔ جب رات کو شاگرد نے اس پر تھوکا تو اس کا تخت ہوا ہو گیا اور انوار تاریک ہو گئے۔ اس طرح اُس نے شیطان کے فریب سے چھٹکارا پایا اور اس کے بعد پھر کچھ بھی نہ دیکھا۔

جو ایسے معاملات میں اپنے اساتذہ و مشائخ سے رہنمائی حاصل نہیں کرتا وہ اسی طرح دھوکے میں رہتا ہے، ہوس کی باتیں کرتا رہتا ہے اور آخری عمر میں اپنے جھوٹے نظریات کے نتیجہ میں دین سے بھی خارج ہو جاتا ہے۔

مجھ تک یہ خبر پہنچی کہ عبدالواحد بن زیدؒ سے اس کی جماعت بھاگ گئی کیونکہ وہ انہیں مجاہدہ عبادت، رزق حلال کھانے اور دنیا میں زہد اختیار کرنے کی تلقین کرتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد عبدالواحد بن زیدؒ نے ان میں سے ایک کو دیکھا تو اس کا اور اس کے ساتھیوں کا حال دریافت کیا۔ شاگرد نے جواب دیا: یا استاذ! ہم ہر رات جنت میں داخل ہوتے ہیں، اور اس کے پھل کھاتے ہیں۔ استاذ نے کہا: اج کی رات مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ الغرض وہ ان کو اپنے ہمراہ صحراء میں لے گئے۔ جب

رات ہوئی تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک جماعت سبز لباس پہنے ہوئے ہے اور باغات اور میوے ہیں۔ عبدالواحدؒ نے ان سبز پوش لوگوں کے پاؤں پر نظر کی تو وہ چوپایوں کے کھروں کی مانند تھے۔ وہ جان گئے کہ یہ شیاطین ہیں۔ جب انہوں نے منتشر ہونے کا ارادہ کیا تو عبدالواحدؒ نے ان سے کہا: کہاں جاتے ہو؟ کیا ادریس علیہ السلام جب جنت میں داخل ہوئے تو اس سے نکلے نہ تھے۔ جب صبح ہوئی تو انہوں نے خود کو چوپایوں کی پیشاب گاہوں پر گوبر اور خچروں کی لید میں پایا۔ تب انہوں نے توبہ کی اور پھر سے عبدالواحد بن زیدؒ کی صحبت اختیار کر لی۔

بندے کو اس بات کا علم ہونا چاہیے کہ جو انوار بھی یہ ظاہری آنکھیں اس دنیا میں دیکھیں وہ مخلوق ہیں۔ اس میں اور اللہ میں کوئی مشابہت موجود نہیں اور نہ ان کا تعلق اس کی صفات سے ہے یہ سب خلق و مخلوق کے سوا کچھ نہیں۔

مشاہدہ ایمان، حقیقت الیقین اور تصدیق کے ساتھ رویت بالقلب حق ہے جیسا کہ فرمان مصطفی ﷺ ہے: اس طرح اللہ کی عبادت کرو کہ گویا تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر تم اسے نہیں دیکھتے تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

کسی تابعی رضی اللہ عنہ نے کہا: اگر پردہ اٹھا دیا جاتا تو میرا یقین نہ بڑھتا۔ اس قول میں انہوں نے اپنے یقین کی حقیقت اور صفاوقت کی جانب اشارہ کیا اور اپنے غلبہ وجد کی خبر دی اور خبر کی حیثیت مشاہدے کی نہیں ہوتی۔

ارشادِ خداوندی ہے:

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی [النجم:۱۱]

ترجمہ: ''دل نے جھوٹ نہ کہا جو دیکھا۔''

یعنی جو اس نے اپنے دل سے دیکھا اسے آنکھ نے نہیں جھٹلایا اور جو اُس نے آنکھ سے دیکھا اسے دل نے نہیں جھٹلایا اور یہ خصوصیت فقط نبی کریم ﷺ کی ہے کسی اور کی نہیں۔

صفاء وطہارت میں غلطی کرنے والے

ایک طائفہ صوفیہ نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ ہمیشہ مکمل طور پاک وصاف رہتے ہیں اور ان کی پاکیزگی کبھی ان سے زائل نہیں ہوتی اور انہوں نے یہ سمجھا کہ بندہ تمام کدورتوں اور برائیوں سے اس طرح پاک ہوجاتا ہے کہ گو وہ ان سے جدا ہوجاتا ہے حالانکہ انہوں نے غلطی کی کیونکہ بندہ ہر وقت جملہ علتوں سے پاک نہیں رہ سکتا اور اگر ایک وقت اس کو طہارت حاصل ہوجائے تو بھی علتوں سے بری نہیں۔ اور صفا ایک وقت سے دوسرے وقت میں بندے کے مقامات کے مطابق حاصل ہوتی ہے تو وہ صفاء کے ساتھ اللہ کا ذکر کرتا ہے اور پھر اس پر دوسری اشیاء کا ذکر جاری ہوجاتا ہے۔

طہارت کا مطلب بندے کے قلب کو سرکشی، حسد، شرک اور تہمتوں سے پاک رکھنا ہے۔ علت سے خالی صفاء اور بغیر تلوین وتغیر کے ہمیشہ کے لیے تمام بشری اوصاف سے پاک ہونا خلق کی صفت نہیں کیونکہ اللہ ہی کی ذات ایسی ہے جو ہر علت سے مبرا اور اپنے سوا ہر شے سے پاک ہے۔ خلق کو ابتلاء وآزمائش کے لیے پیدا کیا گیا ہے تو کیسے وہ علتوں اور اغیار سے مبرا ہوسکتے ہیں جب بندہ کے لیے یہ حکم ہے تو اسے چاہیے کہ اللہ کے حضور توبہ کرے اور ہر وقت اپنے گناہوں کی بخشش مانگے۔

ارشادِ خداوندی ہے:

وَ تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝[النور:٣١]

ترجمہ: ”اور اللہ کی طرف توبہ کرو اے مسلمانو! سب کے سب اس امید پر کہ تم فلاح پاؤ۔“

اور جیسا کہ سید الکونین ﷺ نے فرمایا:

میرے قلب پر ایک بادل سا چھا جاتا ہے تو میں ہر روز سو بار اللہ سے بخشش طلب کرتا ہوں۔

انوار کا غلط مفہوم

ایک جماعت نے انوار کو سمجھنے میں غلطی کی اور یہ خیال کیا کہ وہ انوار کو دیکھتی ہے اور ان میں کچھ نے اپنے قلب کے بارے میں کہا کہ اس میں انوار ہیں یہ لوگ یہ بھی گمان کرتے ہیں کہ یہ وہی انوار ہیں جن سے اللہ نے خود کو متصف فرمایا ہے:

نورِ الٰہی

یہ جماعت یہ سمجھتی ہے کہ شاید نورِ الٰہی بھی چند، سورج کے نور سے مشابہ ہے وہ یہ بھی سمجھتی ہے کہ نور الٰہی سے مراد انوار معرفت وتوحید اور نور عظمت ہے اور یہ کہ وہ غیر مخلوق ہے۔

اس جماعت نے نور الٰہی کے مسئلے میں سخت غلطی کی کیونکہ سارے انوار مخلوق ہوتے ہیں جیسا کہ نورِ عرش، نور کرسی، نور شمس، نور قمر اور نور کواکب۔ اللہ کے لیے کوئی موصوف ومحدود نور نہیں وہ نور جس سے اللہ نے خود کو موصوف کیا وہ نہ تو ادراک میں آسکتا ہے اور نہ ہی محدود ہے خلق کا علم اس کا احاطہ نہیں کرسکتا۔ ہر وہ نور جسے علوم اور فہم وادراک احاطہ کرسکیں وہ مخلوق ہے۔ اللہ کے تمام انوار ہدایاتِ خلق ہیں جب کہ مصنوعات کے انوار عبرت ودلائل، تاکہ ان کے ذریعے وہ معرفتِ توحید پر دلائل لاسکیں اور ان کے ذریعے بحر وبر کی تاریکیوں میں رہنمائی حاصل کی جاتی ہے۔

انوارِ قلوب

انوارِ قلوب کا مفہوم اللہ کے فرقان وبیان کی معرفت حاصل کرنا ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا:

يَاۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا [الانفال:۲۹]

ترجمہ: ''اے ایمان والو! اگر اللہ سے ڈروگے تو تمہیں وہ دے گا جس سے حق کو باطل سے جدا کرلو۔''

آیت کی تفسیر میں کہا گیا کہ فرقان سے مراد وہ نور ہے جو دل میں اتارا جاتا ہے تاکہ اس کے ذریعے بندہ حق وباطل میں فرق کرسکے۔

انوار کے بارے میں یہی کچھ معلومات اس وقت موجود تھیں جو پیش کردی گئیں۔

عین الجمع میں غلطی کرنے والوں کا بیان

ایک گروہ نے عین الجمع میں غلطی کی، جو کچھ اللہ نے خلق سے منسوب کیا اسے خلق سے جدا سمجھا اور اپنے ہر کام کو اپنے نفوس سے متعلق نہ جانا اور اپنے طور پر یہ سمجھتے رہے کہ وہ احتیاطاً ایسا کرتے ہیں تا کہ اللہ کے ساتھ اس کے سوا کوئی اور شے شریک نہ رہے۔ یہ بات انہیں علت سے خروج اور شرعی حدود کو ترک کرنے کی طرف لے گئی کیونکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ وہ اپنے افعال میں مجبور ہیں، اس کا نتیجہ یہ نکلا حدودِ شریعت سے تجاوز اور اتباع کی مخالفت کرتے وقت ان میں اپنے نفس کو ملامت کرنے کی صفت بھی باقی نہ رہی۔ ان میں سے کچھ کو تو اس عقیدہ ونظریہ نے تجاوز کرنے اور بے کار و معطل بیٹھے رہنے کی جسارت دے دی اور نفس نے انہیں یہ جھانسا دیا کہ وہ جو کچھ کرتے ہیں اس میں مجبور و معذور ہیں۔

ان لوگوں نے جو لغزش کی وہ محض فروع واصول سے کم علمی کی بنیاد پر کی اور اصل وفرع میں فرق نہ کیا اور نہ ہی جمع و تفرقہ کا علم حاصل کیا اسی کا انجام یہ ہوا کہ جو چیز فرع سے منسوب تھی اسے اصل سے منسوب کر دیا اور جو چیز تفرقہ سے منسوب تھی اسے جمع سے متعلق قرار دیا۔ الغرض انہوں نے ہر شے کو بے محل کر دیا جو ان کی ہلاکت کا باعث بنا۔

صدیق اور زندیق

سہل بن عبداللہؒ سے کسی نے پوچھا کہ آپ اس شخص کے بارے میں کیا کہتے ہیں جو یہ کہتا ہے: میری مثال دروازے کی سی ہے کوئی حرکت دے تو ہلتا ہوں۔ سہل بن عبداللہؒ نے جواب دیا: ایسی بات دو آدمیوں میں سے ایک کر سکتا ہے۔ یا وہ شخص جو صدیق ہو یا وہ شخص جو زندیق ہو۔

سہل بن عبداللہ نے صدیق اس لیے کہا کہ وہ ہر شے کو اللہ کے ساتھ قائم اور اللہ کی طرف سے سمجھتا ہے، ہر معاملے میں اللہ کی جانب رجوع کرتا ہے اس کے باوجود کہ وہ اصول، فروع، حقوق، حظوظ، معرفتِ حق و باطل، متابعت امر و نہی، حسن طاعات، قیام آداب اور راہ تصوف کو استقامت سے طے کرنے کے بارے میں اپنی ضرورت کے مطابق علم رکھتا ہے۔ اور ان کے قول میں زندیق کا معنی یہ ہے کہ زندیق ایسا قول اس لیے کہتا ہے تا کہ کوئی چیز اسے ارتکاب گناہ سے نہ روکے۔ زندیق کو اس کی جہالت تجاوز اور اس جرأت کی طرف لے جاتی ہے کہ وہ اپنے تمام افعال وحرکت کو اللہ سے منسوب کرتا ہے تا کہ اس طرح شیطان کے گمراہ کرنے سے ارتکاب گناہ اور تاویل باطل پر وہ نفس کی ملامت سے بچا رہے۔ اللہ ہمیں اور آپ کو اس سے پناہ میں رکھے۔

انس، بسط اور ترکِ خشیت کا غلط مفہوم سمجھنے والوں کا بیان

ایک طبقے نے قرب وانس کو بیان کرتے ہوئے یہ خیال کیا کہ چونکہ ان کے اور اللہ کے درمیان انتہائی قرب کی کیفیت موجود ہے تو انہیں ان آداب وحدود کی طرف رجوع کرتے ہوئے شرم دامن گیر ہوتی ہے جن کا وہ پہلے لحاظ رکھتے اور پابندی کرتے تھے لہٰذا انہوں نے ان تمام اعمال کو چھوڑ دیا جن کے انجام دینے سے انہیں شرم دامنگیر ہوتی تھی اور ان افعال سے مانوس ہو گئے جو پہلے ان کو ناگوار گزرتے تھے۔ مختصر یہ کہ انہوں نے اسے اپنا قرب تصور کیا اور اس طرح وہ غلطی کا شکار ہو گئے اور ہلاکت میں پڑ گئے کیونکہ آداب، مقامات اور احوال، اللہ کی جانب سے بندوں کو انعام اور عزت کے طور پر عطا کیے جاتے ہیں اگر وہ اپنے ارادوں میں صادق ومخلص ہوں تو ان کے انعام واکرام میں مزید اضافہ کیا جاتا ہے۔ مگر جب اللہ نے انہیں اپنی توفیق اور عنایت سے محروم کر دیا تو انہوں نے حدود سے تجاوز کیا۔ جن امور کے انجام دینے کا انہیں حکم دیا گیا اس کی انجام دہی سے الٹے پاؤں پھر گئے تو طاعات کے نتیجے میں جو انعامات واکرامات ان کو عطا کئے گئے وہ سلب کر لئے گئے انہیں اللہ نے اپنے در سے دھتکار دیا، اور وہ گمراہوں کے راستوں پر چلنے لگے مگر وہ خود کو پھر بھی مقبول بندوں میں سے شمار کرتے ہیں جس قدر وہ خود کو اللہ سے قریب سمجھتے ہیں اس سے بڑھ کر وہ اس سے دور ہوتے جاتے ہیں۔

ذوالنون علیہ الرحمۃ کہتے ہیں: عارف کے لیے ضروری ہے کہ اس کا نورِ معرفت، نورِ ورع کو بجھا نہ دے علم تصوف میں سے کسی ایسی چیز پر باطنی لحاظ سے عقیدہ نہ رکھے جو ظاہری شریعت سے متصادم ہو اور کثرت کرامت اسے اللہ کے محارم کے پردے اٹھانے پر آمادہ نہ کرے جیسا کہ ایک عارف یہ دعا کیا کرتے تھے: اے اللہ! مجھے اپنے ذریعے اپنے سے غافل نہ فرما اور باوجودیکہ تیرے حضور بغیر طلب کئے مجھے حضور حاصل ہے پھر بھی مجھے اپنی طلب عطا فرما۔

اوصافِ بشری کی بنا کا غلط معنی مراد لینے والوں کا بیان

بغدادیوں کی ایک جماعت نے یہ کہہ کر غلطی کی کہ وہ اپنے اوصاف سے فنا ہو کر اوصاف حق میں داخل ہو جاتے ہیں، حالانکہ اپنی جہالت کے باعث وہ یہ کہہ کر حلول یا اس عقیدے کے حامل ہو جاتے ہیں جو نصاریٰ عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں رکھتے تھے۔ وہ اپنی طرف سے یہ سمجھتے ہیں کہ بعض متقدمین صوفیہ نے اوصاف بشری سے فنا کو اوصاف حق میں داخل ہونے کا نظریہ پیش کیا۔ جب کہ حقیقت اس ضمن میں یہ ہے کہ بندے کو جو ارادہ حاصل ہوتا ہے وہ اللہ کا عطیہ ہے اور یہ کہنا کہ اوصافِ بشری کو فنا کر کے بندہ اوصاف حق میں داخل ہو جاتا ہے دراصل بندے کا اپنے ارادہ سے خروج اور اللہ کے ارادے میں داخل ہونے کے مترادف ہے اور جو یہ جان لیتا ہے کہ ارادہ اللہ کی جانب سے عطیہ ہے اور مشیتِ الٰہی کے مطابق چاہتا اور اسی کے فضل کے ساتھ وہ اس مقام کو پہنچتا ہے کہ خود اپنے احساسِ نفس سے منقطع ہو کر کلیتہ اللہ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ تو یہ اہل توحید کا مقام ہے۔

جنہوں نے اس ضمن میں ٹھوکر کھائی اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک معمولی سی بات کو نہ سمجھ سکے اور یہ اوصافِ حق ہی کو حق سمجھ بیٹھے اور یہ سب کفر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ قلوب میں حلول نہیں کرتا بلکہ قلوب میں ایمان باللہ توحید اور تعظیم ذکر، تحقیق اور تصدیق کے لوازمات کے ساتھ حلول کیے ہوئے ہوتا ہے اور اس سلسلے میں خاص و عام کی کوئی تفریق نہیں ہوتی سوائے اس کے کہ خواص کو ایک حقیقت تک رسائی حاصل ہوتی ہے جو صرف ان ہی کا حصہ ہے کیونکہ وہ خواہشات نفس کی دعوت کو ٹھکرا چکے ہوتے ہیں، گھر کی لذتیں ختم کر چکے ہوتے ہیں، ایمان باللہ میں پوری طرح مخلص و صادق ہوتے ہیں اور عوام ان حقائق سے دور رہتے ہیں کیونکہ وہ نفس اور خواہش کے غلام ہوتے ہیں۔ یہ ہے عام اور خاص میں وہ فرق جو اس ضمن میں ہم نے بیان کر دیا۔

گمشدگی حواس اور اس کا غلط مفہوم

اہل عراق میں سے ایک جماعت کا یہ نظریہ تھا کہ وجد کے عالم میں حواس کھو بیٹھتے ہیں یہاں تک کہ انہیں کسی شے کا احساس تک نہیں رہتا اور وہ محسوسات کے اوصاف سے بھی خارج ہو جاتے ہیں۔

اس جماعت نے غلط سمجھا کیونکہ جس کا گم ہو جانا حس ہی کے ذریعے معلوم ہوتا ہے چونکہ حس صفت بشریت ہے اگر اس پر وہ واردات غالب آ جائیں جو قلوب پر وارد ہوتی ہیں، تو حس ماند پڑ جاتی ہے جیسا کہ ستاروں پر سورج کی روشنی غالب ہونے کے سبب وہ ماند پڑ جاتے ہیں۔ اسی طرح زندہ انسان کی حس بھی زائل ہوتی ہے اور نہ گم بلکہ بعض اوقات بندہ اپنی حس کے ذریعے اذکارِ قوی کے وقت شدید وجد کے باعث اپنی حس سے غائب ہو جاتا ہے جیسا کہ میں نے جعفر علوی سے اس ضمن میں پوچھا تو انہوں نے یہ بات سنائی کہ جنیدؒ نے کہا: میں نے سری سقطیؒ سے اذکارِ قوی کے وقت بندے پر شدید وجد کے غلبے کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا: وہاں! ایسا ہوتا ہے اور ایسی حالت میں بندے کے منہ پر تلوار کا وار کیا جائے تو بھی اسے محسوس نہ ہوگا۔

یہاں محسوس نہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ درد محسوس نہ کرے گا یعنی حس ہی کے ذریعے درد کو محسوس نہیں کرے گا اور حس ہی کے ذریعے درد محسوس کرے گا۔

جب تک انسان میں روح باقی رہتی ہے اور وہ زندہ ہو تو اس کی حس ختم نہیں ہوتی کیونکہ حس زندگی اور روح کے ساتھ لازم ہے۔

روح سے متعلق غلط نظریات

ایک جماعت وہ ہے جس نے ارواح کے بارے میں غلطیاں کیں۔ ان کے کئی طبقے ہیں اور ان تمام نے غلطی کی اور گمراہ ہوئے۔ کیونکہ انہوں نے ایک ایسی چیز کی کیفیت میں غور و فکر کیا جس سے اللہ نے کیفیت ہی کو علیحدہ رکھا اور اسے احاطہ علم سے دور کیا۔ اس نے کسی کو یہ اجازت نہیں دی کہ وہ روح کے بارے میں اللہ کی بیان کردہ تعریف کے علاوہ کچھ کہے۔

ایک جماعت نے کہا: روح، اللہ کے نور میں سے ایک نور ہے اور اسے اللہ تعالیٰ کا نور ذاتی سمجھا جس نے انہیں ہلاکت سے دوچار کیا۔

ایک اور جماعت نے یہ کہا کہ روحِ اللہ کی حیات سے ایک حیات ہے۔

بعض نے یہ کہا کہ ارواح مخلوق ہیں اور روح القدس اللہ کی ذات سے ہے۔

ایک گروہ نے یہ کہا کہ عوام کی ارواح مخلوق اور خواص کی ارواح غیر مخلوق ہیں۔

کچھ لوگوں نے کہا کہ ارواح قدیم ہیں نہ مرتی ہیں نہ عذاب میں مبتلا کی جاسکتی ہیں اور نہ پرانی ہوتی ہیں۔

بعض کا یہ خیال ہے کہ ارواح ایک جسم سے دوسرے جسم میں حلول کرتی ہیں۔

ایک طائفہ یہ خیال رکھتا ہے کہ کافر کی ایک، مومن کی تین اور انبیاء و صدیقین کی پانچ ارواح ہوتی ہیں۔

کسی نے کہا کہ روح، نور سے پیدا کی گئی ہے۔

بعض نے یہ کہا کہ روح، روحانیت ہے جسے ملکوت سے پیدا کیا گیا جب صاف ہوتی ہے تو عالم ملکوت کی طرف لوٹ جاتی ہے۔

کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ روحیں دو طرح کی ہیں لاہوتی اور ناسوتی

الغرض مذکور بالا تمام لوگوں نے جو کچھ بھی روح کے بارے میں کہا غلط کہا، کھلی گمراہی میں پڑے اور اس سے بے خبر رہے کہ اس سلسلے میں وہ غلطی کا شکار ہوں گے اس کی وجہ ان چیزوں میں تعمق و تفکر ہے جس سے اللہ نے انہیں منع فرمایا جیسا کہ قول باری تعالیٰ ہے:

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ [بنی اسرائیل:۸۵]

ترجمہ: ''اور تم سے روح کو پوچھتے ہیں تم فرماؤ! روح میرے رب کے حکم سے ایک چیز ہے۔''

روح کے بارے میں اہل حق کا نظریہ

جہاں تک روح کے بارے میں اہل حق کے نظریہ کا تعلق ہے تو ان کے مطابق تمام ارواح مخلوق ہیں وہ اللہ کے امور میں سے ایک امر ہے۔ ان کے اور اللہ کے درمیان کوئی ناطہ اور تعلق نہیں سوائے اس کے کہ وہ اس کی مملکت میں سے ہیں، اس کے تابع فرمان ہیں، مسلسل اس کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔

ارواح ایک جسم سے نکل کر دوسرے میں داخل نہیں ہوتیں۔ وہ اسی طرح ذائقہ موت چکھتی ہیں جس طرح بدن، بدن کے ساتھ ہی آرام و آسائش پاتے ہیں اور بدن ہی کے ساتھ عذاب محسوس کرتی ہیں۔ ارواح انہیں جسموں میں جمع ہوں گی جن سے نکلی ہوں گی۔

حضرت آدم علیہ السلام کی روح کو اللہ نے ملکوت سے اور اس کے جسم کو خاک سے پیدا فرمایا۔

سطور گزشتہ میں ہم نے جن جن لوگوں کے روح کے بارے میں باطل نظریات پیش کئے ان کو ثابت کرنے سے متعلق ہر ایک کے پاس اپنے اپنے دلائل ہیں۔ اور اسی طرح اہل حق کے بھی ان کی تغلیط اور رد میں واضح بیانات موجود ہیں مگر ہم نے طوالت کے خوف سے اختصار پر اکتفاء کیا۔ بہر حال جو کچھ بیان کیا گیا وہ اس علم کے طالبین کے لیے کافی ہے۔ ان شاء اللہ اللہ تعالیٰ۔

کتاب اللمع فی التصوف، اللہ جل جلالہٗ کی حمد اور اس کی اعانت و توفیق سے اختتام کو پہنچی، بے شک اللہ ہی ہمیں کافی اور وہی بہترین چارہ ساز ہے۔

بے حد و شمار، دائمی و مسلسل درود و سلام ہوں ہمارے سردار محمد ﷺ اور ان کی آل اطہار پر جب تک کہ ستاروں میں چمک رہے، تاریکیاں سیاہ ہوتی رہیں، صبح طلوع ہوتی ہیں، وقت چلتا رہے، فکر کے چراغ جلتے رہیں، ذاکر ذکر کے روح پرور ترانے الاپتے رہیں، چلنے والوں کا سفر جاری رہے، گھٹائیں برستی رہیں، غروب ہونے والے غروب ہوتے رہیں خطیب شعلہ نوائی کرتے رہیں، سائے پھیلتے رہیں، بہار کی پھواریں پڑتی رہیں، علم کی باتیں ذہن کے دریچوں میں اترتی رہیں، مخلوق جامِ ہستی سے سرشار رہیں، حسن اسلام باقی رہے، شب دیجور سمٹتی رہے، اندھیرے، اُجالے کا اختلاف باقی رہے، پو پھٹتی رہے، ہوائیں چلتی رہیں، ملائک مشغول تسبیح رہیں، افلاک گردش میں رہیں، زوال کے سایے ڈھلتے رہیں، ذی روح زندگی کی نعمت سے شاد کام رہیں، عدد کا مشار ہوتا رہے، ابد کا دوام رہے، زباں گویا ہے، مشاہدے، سچائیاں اگلتے رہیں، شبنم کے موتی لٹتے رہیں، زمانہ پھیلتا رہے، موجوں میں اضطراب رہے، چراغوں میں روشنی رہے، انوار جھلملاتے رہیں، اول شب کی تاریکیاں گہری ہوتی رہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ”میں نے نبی کریم ﷺ سے علم کے دو برتن یاد رکھے ہیں ایک برتن کو میں نے پھیلا دیا، دوسرے کو اگر پھیلاتا تو میرا یہ حلقوم کاٹ دیا جاتا“۔ (صحیح البخاری، رقم الحدیث ۱۳۰)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”من عمل بما علم اورثه الله علم مالم یعلم“ جو شخص اپنے علم پر عمل کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اسکو ایسے علم کا وارث بناتا ہے جس سے وہ آگاہ نہیں کتاب اللمع ”عارفِ حقیقت“ کا تحریر کردہ دستورِ تصوف ہے، اگرچہ یہ بھی حقیقت ہے کہ حقیقت تک رسائی، شریعت کے راستے کے بغیر ممکن نہیں عالم محض شریعت سے باخبر ہوتا ہے مگر عارف شریعت و حقیقت دونوں سے آگاہ ہوتا ہے۔

احمد ابن عجیبہ الحسنی عالم اور عارف کے درمیان فرق سمجھاتے ہوئے الفتوحات الالٰھیة میں رقمطراز ہیں

- عالم اپنے قول سے فروتر ہوتا ہے جبکہ عارف اپنے قول سے برتر ہوتا ہے۔
- عالم محجوب ہوتا ہے جبکہ عارف محبوب ہوتا ہے۔
- عالم اہلِ یمین کے قبیلہ سے تعلق رکھتا ہے۔ جبکہ عارف مقربین کے قافلہ میں سفر کرتا ہے۔
- عالم اصحاب برہان سے اور عارف اصحابِ عیان سے جُڑا ہوتا ہے۔
- عالم اہلِ مباحثہ سے جبکہ عارف اصحابِ مشاہدہ سے تعلق رکھتا ہے۔
- عالم اہل فرق میں عارف اہلِ جمع میں شامل ہوتا ہے۔
- عالم ایّاکَ نعبد کا پیکر جبکہ عارف ایّاك نستعین کا نمونہ کامل ہوتا ہے۔
- عالم اسباب کو پیش نظر رکھتا ہے اور عارف کی نظر مسبب الاسباب پر ہوتی ہے۔
- عالم شرک جلی سے ڈرتا ہے جبکہ عارف شرک خفی سے بھی خلاصی حاصل کرتا ہے۔
- عالم، احکام الٰہی کی معرفت رکھتا ہے جبکہ عارف سے ذاتِ الٰہی کی معرفت کی خوشبو آتی ہے۔

اگر تم عارف بننا چاہتے ہو تو شریعت کی زمین پر حقیقت کے سمندر سے اتنا پانی چھڑکو کہ شریعت، حقیقت کے پانی سے سیراب ہو جائے۔ شریعت عین حقیقت ہو جائے اور حقیقت عین شریعت بن جائے، لیکن ”حقیقت“ کا انکار نہ کرنا۔

اِذا لم تر الهلال فسلم
لِاناسٍ راؤه بالابصار

اگر تم نے چاند نہیں دیکھا تو ان لوگوں کی بات مان لو جنہوں نے ’آنکھوں‘ سے چاند دیکھا ہے۔

عطاء المصطفیٰ مظہری پی ایچ ڈی اسکالر